

حدیث کے سب سے بڑے مجموعے

مُسْنَدِ أَحْمَد کی حقیقت

از

جامع العلوم، محدث العصر علامہ تمثنا عمادی پھلواری

شائع شدہ

الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

مکان نمبر ۳-۷-۱۷ بلاک اناظم آباد

نزد مسجد قدوسیہ - کراچی ۷۴۶۰۰

فون : ۶۲۱۴۴۹

قیمت : ----- ۱۲ روپے

حدیث کے سب سے بڑے مجموعے

مُسْنَدِ أَحْمَدُ کی حقیقت

از

جامع العلوم، محدث العصر علامہ تمنا عماوی پھلواری

شانِ روز

الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ (پریس)

مکان نمبر ۳۷-۱-۱ اے بلاک انارک آباد

نزد مسجد قدوسیہ کراچی ۷۴۶۰۰

فون : ۶۲۱۳۳۹

قیمت : ۱۲ روپے

تأثرات بروفات علامہ تمنا عمادی مجیبی

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی 'ایم' اے 'پی' ایچ ڈی استاد فلسفہ
لسانیات، ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جده مشیر امور اقلیات، رابطہ اسلامی
مکہ مکرمہ۔ حال ناظم تعلیمات ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

برصغیر ہند و پاک کے ایک مقتدر عالم دین، وسیع النظر محقق اور اردو
فارسی کے بلند پایہ ادیب و شاعر مولانا محی الدین تمنا عمادی ۷۷ سال کی عمر میں گزشتہ ماہ
وفات پائی۔

وہ صوبہ بہار کے ایک مردم خیز قصبہ پھلواری کے رہنے والے تھے، اور ایک ایسے
علمی و دینی خاندان کے رکن تھے۔ جہاں کچھ اوپر دو سو سال سے علم و شیخت کا سلسلہ
قائم ہے، ان کو فارسی اور فن عروض میں ماہرانہ دستگاہ حاصل تھی۔ مولانا سید سلیمان
ندویؒ نے اپنے ایک مقالہ میں بہار کی باکمال شخصیتوں کا تعارف کرایا ہے، اس میں
مولانا عمادی مجیبی کا تذکرہ اسی حیثیت سے کیا ہے، یہ مقالہ سید صاحب کے مجموعہ
مقالات نقوش سلیمانی میں موجود ہے۔ مولانا عمادی مجیبی بہت ہی ذہین، اعلیٰ درجہ
کے طباع اور نکتہ سنج تھے، انھوں نے درس نظامی کی تکمیل اپنے والد اور خاندان کے دوسرے
بزرگوں مولانا حکیم علی نعمت اور مولانا محمد منظور احمدؒ سے کی تھی، اور کچھ عرصہ تک متوسطا کی
کتابوں کا درس بھی دیا تھا، ان کے والد مولانا شاہ نذیر الحق فائز ایک وسیع الاستعداد
لے خود علامہ تمنا کے ارشاد کے مطابق اور علامہ کشاگرؒ مولانا اسد القادری کی تحریر کے مطابق
درس و تدریس کا زمانہ چودہ پندرہ سال پر محیط ہے۔ اور اس دوران ابتدائی کتابوں
سے انتہائی کتابوں تک سب کا درس دیا۔ (ظاہر)

عالم تھے۔ فارسی میں فکر سخن کرتے تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ پروفیسر ڈاکٹر افضل امام صاحب نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ مولانا عوامی کا ابتدائی تعارف بھی ایک شاعر کی حیثیت سے ہوا، ان کی شاعری زیادہ تر بلکہ تمام تر نعت نبوی پر مشتمل تھی وہ فارسی اور اردو میں پرجوش اور پرکیف نعتیں کہتے تھے۔ نعتوں کے ضمن میں اصلاح و معظمت کے مضمون بھی بڑی خوبی سے نظم کرتے، ان کے فنی طریقت اور استاد شاہ رشید الحق عوامی سجادہ نشین خالقاہ عمادیہ پٹنہ، جو ان کے آبائی رشتہ سے چچا بھی تھے۔ مولانا تمتا عوامی کو "حسان الہند" کہا کرتے تھے، چنانچہ ان کی نظموں کے ابتدائی مجموعے "حسان الہند علامہ تمتا عوامی" جیسی پھلواڑی کے نام سے شائع ہو کر آئے تھے افسوس کہ ان سطروں کی تحریر کے وقت ان کے اشعار کا کوئی مجموعہ نہیں ہے جو نمونہ کے طور پر پیش کیا جاسکے۔ البتہ چند متفرق اشعار جو حافظے کے گوشوں میں پراگندہ پڑے ہوئے ہیں ان کا یہاں درج کرنا مناسب نہ ہوگا۔

حضرت جابر بن سمرہ کی ایک روایت شامل ترمذی میں ہے کہ وہ ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مینے چادروں میں ملبوس دیکھ رہے تھے کبھی وہ چاند کو دیکھتے اور کبھی حضور انور کو! اور کہتے کہ مجھ کو حضور انور چاند سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہے تھے اس واقعہ کو مولانا تمتا عوامی نے نظم کیا تھا! اس نظم کا ایک شعر یہ ہے۔

رات بھر کیوں نہ تجھے چاند میں دیکھا بس کہوں

ان کی صورت سے بہت ہلستی ہے صورت میری

شاعری ان کے فن عروضی میں ماہرانہ دستگاہ کا نتیجہ تھی۔ مگر پھر بھی اکثر اشعار سلیس اور رواں ہوتے تھے مثلاً ایک نظم کا پہلا شعر ہے۔

شبنوۃ احباب جدا، شکوۃ اغیار جدا

میرے افسانے کے ہیں دو باب، ہر اک باب جدا

یہ یہ معروضی مضمون نگار کے مرقوم نام کی ہے کچھ زیادہ شاید اس معروضی ہر "شکوۃ غیر جدا، شکوۃ احباب جدا"

ان کی شاعری کا اصلی رنگ فارسی میں کھلتا تھا ایک مشہور زمین میں ان کے یہ دو شعر سنئے۔

حاشا کہ دل از ناوکِ جان گلدارو ۛ بر بادِ سر لے کر زمہاں گلدارو

دیوان بکار است چہ دادند کدوش ۛ داماں گلدارو کہ گریباں گلدارو

مولانا تمغہ دہی کے شاگردوں کی تعداد خاصی تھی جن میں بعض بہت کامیاب

شعرا بھی رہے ہیں جیسے نجم، ارمان اور شفیع تمنائی پھلواری، ان کے علاوہ خاندان

کے اکثر و بیشتر نوجوان جن کے اندر شاعری کی امنگ پیدا ہوئی، مولانا سے ہی

رجوع کرتے تھے۔ مگر شعر و ادب سے دلچسپی جوانی ہی کی عمر میں کم ہو گئی تھی، علمی،

تحقیقی مصروفیات نے اس ذوق پر غلبہ حاصل کر لیا تھا لیکن شعر و ادب سے وہ

کلیتہً مستغنی نہیں ہوئے تھے، اپنے وسیع اور عالی شان مکان کا نام انھوں نے دارالادب

ہی رکھا تھا جو ان کی ہجرت پاکستان کے بعد دوسروں کے قبضے میں آیا مگر اس کے

دروازوں کا کتبہ اب بھی باقی ہے۔

دو خاندانی صوفی تھے، تصوف کی گودوں میں پلے تھے، ان کے جدا مجید (جسٹ پست

کے دادا) حضرت تلج العارفین شاہ محمد مجیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کے اخلاف کی

روح فقہاء میں پھلواری اور پٹنہ میں موجود ہیں۔ ان کی خانقاہوں کے ”رسوم و آداب“

مخالص دیوبندی طرز کے ہیں نہ بریلوی انداز کے، ان دونوں کے درمیان ایک معتدل

اور متوسط انداز کی رسمیں وہاں رائج ہیں جن میں رسم سماع بھی شامل ہے۔ مولانا تمنائی

عمادی ان مروجہ مراسم تصوف سے گہرا تعلق رکھتے تھے، ذکر، شغل، مراقبہ، قبور سے بے کر

حال قال میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بن ان مراسم سے دل برداشتہ ہو گئے

بلکہ ان کے سخت مخالف ہو گئے۔ اس تبدیلی کا سبب خواہ کتاب و سنت کے مطالعہ کا خاص

انداز رہا ہو یا کوئی دوسرا نفسیاتی سبب اس کا تعین دشوار ہے۔ بہر حال یہ باتیں راجح و

مخبرہ علامہ تمنائی کے ارشاد کے مطابق (جیسا کہ مولانا ظفر احمد عثمانی کے نام خط میں انھوں نے تحریر کیا ہے) تصوف

اور اس کی رسوم و عادات کے بعد کی وجہ کتبہ، سیر رسول اور سیر اصحاب رسولؐ کے غیر جائزہ و مطالعہ تھا۔

وہ ملاحظہ ہے ایک خاندانی پیڑھانے کے فرد کے لئے صوفیانہ رسوم سے فائدہ ہی قائم ہے تھے۔ (ملاحظہ

کے وجود سے پہلے کہیں۔ اس لئے ان پر رائے زنی آسان نہیں ہے کہ تصوف سے انحراف و انکار کا باعث کیا تھا۔ البتہ جو چیز ہوش سنبھالنے کے بعد دیکھی اور سنی وہ یہ تھی کہ سنی تصوف، خانقاہ اور خانقاہیت کے شدید منکر تھے۔ وہ اپنے گھر پر ہر جہہ کو درجہ قرآن کا جلسہ کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم سے ان کو شغف تھا، عربی لغت و نحو پر ان کو عبور کامل تھا تفسیروں پر نظر تھی۔ تصوف پر جب وہ نیکر کرتے تو کہا کرتے تھے کہ مجھے یہ الزام نہیں دیا جاسکتا کہ

سہ لذت ایں بادہ ندانی بخدا تانا چشتی

تصوف کے انکار سے ان کے اندر ایک ذہنی انقلاب پیدا ہوا۔ انہوں نے اپنی عمر میں بار بار رائے تہیں بدلی۔ یہی ایک تبدیلی تھی جو اول و آخر ہوئی مگر اس کے نتائج بہت دور رس اور بعد میں تکلیف دہ حد تک غلو کی شکل میں نمایاں ہوئے۔ پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ وہ تحقیق میں تقلید سے آزاد ہو گئے وہ مسائل میں تحقیق کے وقت براہ راست قرآن و احادیث اور زیادہ تر قرآن کریم سے استشہاد کرتے۔ ائمہ مجتہدین اور ان کے پیروں کے اقوال ان کے لئے دلیل کا درجہ نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے مقالات میں حوالے کبھی ثانوی مآخذ

(SECONDARY SOURCES) کے نہیں دیتے تھے۔ انکار تصوف کا دوسرا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ تصوف کے "سلسلہ الذہب" سے ان کے اندر ایک کہ پیدا ہو گئی اور متاخرانہ جوش میں وہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور خاندان رسالت کے افراد پر اس طرح تنقید کرتے جس طرح شیوہ سنی مناظرہ کرنے والے بعض اہل سنت علماء کرتے ہیں بلکہ ان سے بھی دو قدم آگے۔

لے یہ نتیجہ تو بہت مبارک تھا اسے "تکلیف دہ حد تک غلو" کہنا بڑی زیادتی ہے۔ تحقیق حق میں اگر کوئی شخص اپنے خاندانی یا علمی کا بڑا فرقہ کی تقلید سے آزاد نہ ہو تو وہ تحقیق کر ہی نہیں سکتا۔ (ظاہر ہے)

مذہب علامہ بنی خود مہتمم مذاہب نگار کے ارشاد کے مطابق حضرت فاطمہؑ کی اولاد سے جتنے معنی بنی حوالہ کے مطابق سید تھے بعد حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ ان کے جدا مجتہد تھے۔ پھر صحابی تھے اور علامہ کا مسلک تو ازاول تا آخر اسوہ صحابہ کی نہیں تھا جسے وہ قرآنی اصطلاح میں سبیل المؤمنین کہا کرتے تھے اور اس عنوان پر انہوں نے "قاعدہ ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ لہذا اگر وہ صحابہ کرام کی اکثریت کے مقابلہ میں اپنے اجداد کی ایک آدم خطہ اجتہادی کا اعتراف کرتے تھے تو یہ تو ان کی حق شناسی کا بہت بڑا ثبوت ہے نہ کہ تکلیف دہ حد تک غلو"۔

غالباً یہی رگ تھی جس نے ان کے قلم سے محمود عباسی کے ان خرافات کی بھی تائید کرادی۔ جن پر تحقیق کا لیبیل علم پر ایک بدترین تہمت ہے جس میں کھلا دجل، عبارتوں کی قطع و برید، غلط انتساب سب کچھ ہے۔

وہ حدیث کے منکر تھیں تھے۔ یہ ان پر اتہام ہے۔ وہ نام نہاد اہل قرآن کی طرح علم حدیث سے کورے نہیں تھے۔ بلکہ رجال احادیث پر ان کا اتنا بڑا کام ہے جس کی نظیر بہت سے شیخ الحدیثوں کے یہاں نہیں مل سکتی، وہ صرف یہ کہا کرتے تھے کہ حدیث قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتیں اور جو حدیثیں نص قرآن سے متعارض ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نہیں ہو سکتیں۔ مگر ہندو پاک کے اس گروہ نے جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتا ہے، مولانا کی تحریروں سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ اجادیت کے متون اور رجال حدیث کی بحثیں جن کا جائزہ لینا ان کے بس میں نہ تھا اس کام کو مولانا عمادی انجام دیا کرتے تھے اس میں ان کی تائید کے پہلو مل جاتے، اُس کو اجاگر کر کے پیش کرتے، اس طبقہ کے اس طرز عمل نے مولانا کو کئی نقصان پہنچائے۔ ایک طرف تو مدارس کے علمائے ان کو بھی

(بقیہ مکتبہ کاغذیہ) اگر اہل المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ، حواری رسول حضرت زبیرؓ اور حضرت سادہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی خطا اجتہادی پر زور دیتا اور اس کا برہہ پیش نہ کرتا بلکہ اسے عقیدہ بنالینا جرم نہیں ہے تو حضرت علیؓ و حضرت حسینؓ کی کسی خطا اجتہادی کا قائل ہونا جرم کیوں ہو؟ کیا اہل المؤمنین حضرت عائشہؓ صدیقہ اور حواری رسول حضرت زبیرؓ کی خطائے اجتہادی کا تذکرہ کرنے والے بھی ”تکلیف دہ حد تک غلو“ کے مرتکب کہہ سکتے ہیں یا ان کے خطا اجتہادی کا تذکرہ کرنا جرم نہیں ہے؟ حضرت! اگر اصول ہو تو سب کے لئے یکساں ہونا چاہئے۔ ورنہ صحابہ کرام میں سے کچھ کے لئے معیار جدا ہوا اور کچھ دوسروں کے لئے جدا معیار ہو یہ طرز عمل اصول اور عدل کے خلاف ہے اور فی الحقیقت ”تکلیف دہ حد تک غلو“ یہ طرز عمل ہے نہ کہ علامہ غما کی اصول پسندی جس کی وجہ سے تمام صحابہ کرام کو ایک نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ (طاہر) ملے محرم مقالہ نگار کا یہ فیصلہ بھی اتنا پسندانہ ہے۔ عباسی مرحوم کی یہ کتاب نہ اس قدر بُری ہے جیسا کہ مقالہ نگار کا ارشاد ہے۔ نہ ایسی غیر معمولی جیسا کہ اس کتاب کے معتقدین سمجھتے ہیں۔ اگر محرم مقالہ نگار اس کتاب کو اس حد تک بدترین سمجھتے ہیں تو انہیں کسی مختصر مقالہ ہی میں ہی اس کتاب کی علمی تنقید کرنی چاہیے نہ جذباتی انداز کے الزامات نامناسب ہیں۔

پرویز جیسا مدعی علم سمجھ لیا اس لئے ان کی باتوں کو قابل توجہ نہیں سمجھا اور کہیں ان کا نام بھی لیا تو اسی انداز سے جس طرح پرویز صاحب کا نام تحقیر و استحقاف کے ساتھ علمی و دینی حلقوں میں لیا جاتا ہے۔

دوسری طرف ان محمود عباسیوں، پرویزیوں اور اہل قرآنوں نے مولانا تمنا کی مکمل بات سامنے نہیں آنے دی۔ چند ماہ پہلے ماہنامہ فاران میں مولانا تمنا کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے اس مظلومیت کا اظہار کیا تھا۔

عالم باعمل | بہر حال اپنے ”موتی“ کا ذکر خیر کرنا چاہئے، ان کی خاص بات جس کی شہادت ان کے انتقال کے بعد دی جاسکتی ہے اور جس کی شہادت میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہے۔ یہ ہے کہ وہ مخلص اور سچے مسلمان تھے، انھوں نے جو کچھ لکھا اور کہا وہ ان کے ضمیر کی آواز تھی اور ان کی تحقیق کا نتیجہ تھا، انھوں نے اپنے نظریہ کے تحت رکسی یافت کے لئے نہیں اپنا جاما جاپا، ہرزینہ، بی اور عزت کی زندگی، خوشحالی اور فارغ السہالی کی معیشت کو چھوڑ کر۔ مشرقی پاکستان میں ہجرت کی، اپنے اعزہ اور خاندان کے افراد جن کی بے پناہ محبت ان کے دل میں تھی اور جن کے نازک سے نازک جذبات کا وہ احترام کرتے تھے۔ ان سب کی بے رخی مولیٰ، ان کے اخلاص و صداقت کا ایک نمونہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی دو بیٹیوں کی شادی ایسے خاندان میں کر دی جس کو بیمار کی ہندو اور معاشرہ سے متاثر مسلم معاشرہ کیسی اعتبار سے پست سمجھتا تھا، اور خاص طور سے ”پھلواری“ کے مشائخ کا خاندان جو اس کو ”ناک کٹنے“ کے مرادف سمجھتا تھا، وہاں انھوں نے کسی تنقید کی پروا نہ کی، یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ اقدام وہی کر سکتا تھا جس کو اپنے عقائد پر اطمینان کامل ہو، یوں وعظ کہتا اور مضمون لکھ دینا آسان ہے مگر عملی اقدام وہی کر سکتے ہیں جو اولوالعزم ہوں!

ان کا دوسرا وصف یہ تھا کہ وہ عمر بھر ایک نہ تھکنے والے مہنتی طالب علم رہے۔ اپنے ہوش سنبھالنے سے لے کر بستر مرگ تک جبکہ ان کو اپنی موت صاف نظر آرہی تھی علمی تحقیق و جستجو میں مصروف رہے، راقم الحروف کے پاس ان کا آخری خط نومبر کی کسی تاریخ کا ہے انتقال سے

دس پندرہ روز پہلے لکھا تھا۔ اس کی ابتداء اس طرح کی تھی کہ یہ خط اپنے بستر مرگ سے لکھ رہا ہوں اس خط میں بھی قرآن کریم کے چند الفاظ اور ان کی تفسیر پر تحقیقات کا منسل ذکر تھا۔ ان کے اس خط کو پڑھ کر مجھے ایک بزرگ عالم کا واقعہ یاد آیا کہ انھوں نے اپنے آخری لمحات زندگی میں کسی سے قرآن فیض کے ایک مسئلہ کو دریافت کیا 'لوگوں نے کہا یہ آپ کا آخری وقت ہے اس وقت آپ یہ معلوم کر کے کیا کریں گے انھوں نے جواب دیا کہ کسی شے سے واقف ہو کر مرنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ جاہل رو کر مروں !

مولانا تمت عبادی مجیدی ۷۷ھ میں ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے اور ۱۳۹۲ھ میں کراچی میں مسافرانہ سیکسی کی حالت میں فوت ہوئے حق تعالیٰ جل شانہ کی شای رحمت جو مغفرت کے لئے یہاں ڈھونڈتی ہے ان کو بخش دے۔ (آمین)

(ماہنامہ کاروان کراچی، مارچ ۱۹۷۳ء، ص ۷۵)



مسند احمد کی حقیقت

قند پر داز راویوں نے نہ صرف یہ کہ ہزاروں جعلی حدیثیں گھڑیں، غضب یہ ہے کہ بعض دیدہ دلیروں نے ہزاروں صفحات کی پوری پوری کتابیں گھڑ کر اکابر آئمہ امت کے نام منسوب کر کے مشہور کر دیں ان میں سے ایک جعلی کتاب مسند احمد جو دس جلدوں میں تیس چالیس ہزار کے قریب روایات کا مجموعہ ہے۔ یوں تو حدیث کی کئی کتابیں متاخرین نے خود جمع کیں اور ان کو اگلے بزرگوں میں سے کسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام تو عوام ہیں بعض خواص بھی کچھ دنوں کے بعد اس نسبت سے دھوکا کھا گئے اور اس کتاب کو انھیں بزرگ کی تالیف سمجھنے لگے، جن کی طرف اس کی نسبت کر دی گئی۔ مثلاً حافظ ابن حجر نے تعجیل المنفد کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ محمد بن علی بن حمزہ الحسینی نے مسند امام شافعی اور مسند امام ابی حنیفہ کا ذکر اس طرح کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کتابوں کو ان بزرگوں کی عاص تالیف سمجھتے تھے۔ حالانکہ مسند شافعی کو بعض نیشاپوریوں نے کتاب الام وغیرہ سے اور بعض حدیثیں ابو العباس الامم سے لیکر جن کو وہ تنہا ریح بن سلیمان سے روایت کرتے تھے۔ ایک مسند شافعی مرتب کر رکھی تھی۔

اسی طرح امام ابو حنیفہ کے تین سو برس بعد ان سے منسوب روایات کو ابو محمد الحارثی نے امام ابو حنیفہ ہی کے شیوخ پر مرتب کر کے ایک مجموعہ تیار کیا اور اس کا نام مسند ابی حنیفہ رکھ دیا، اس کے بعد اسی میں سے مرفوع حدیثیں چن کر ابو بکر بن المقرئ نے ایک مختصر سی مسند ابی حنیفہ مرتب کی۔ مسند حارثی ہی کی طرح ابن خضرونے بھی ایک مسند

ابی حنیفہ جمع کی جو کافی مشہور ہے اور سب سے آخر میں خوارزمی نے ایک ضخیم جامع المسانید مرتب کر ڈالی، جو اگلی کتلوں کی جامع ہے۔

تو جب ابن حمزہ الحسینی جیسے محدث ماہر رجال، جو ابن حجر سے بھی مستند تھے صرف نسبت کی وجہ سے دھوکا کھا گئے تو یہ تابد گیراں چہ رسد مگر یہ جامعین مسند چونکہ امام شافعی و امام ابو حنیفہ سے بہت زیادہ متاثر تھے اور پھر ان کی یہ جمع و تالیف کسی خاص اجتماعی سازش کے ماتحت نہ تھی بلکہ مختلف اشخاص کی الگ الگ کوششیں تھیں اور ہر مؤلف کی کوشش خاص اپنے ہی فرقہ کی تائید میں تھی، جس کی وجہ سے دوسرے فرقہ والوں نے ان کتلوں کی نسبتوں کو صحیح ثابت نہ ہونے دیا اور خود اس فرقہ کے نڈھ لوگوں نے بھی دوسروں کی تکذیب کی تائید کی، عیساکہ ابن حجر نے خود اعتراف کیا کہ مسند شافعی امام شافعی کی تالیف نہیں بلکہ ان سے منسوب روایات کو ان کے بہت بعد بعض نیشاپوریوں نے مسند شافعی کے نام سے جمع کیا ہے۔

بخلاف مسند امام احمد کے کہ یہ ایک خاص اجتماعی سازش کے ماتحت جمع کی گئی اور اس کے جامعین کی غرض ہی یہی تھی کہ اس کو جس طرح بھی ہو خاص امام احمد کی تالیف ثابت کر کے رہیں اور اس کا اہتمام امام احمد کی وفات کے کچھ بعد ہی سے نہیں بلکہ عجب کیا ہے کہ ان کی گوشہ نشینی کے وقت ہی سے اس کی تالیفی داغ بیل ڈال دی گئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مسند امام شافعی کی جامع کی غرض اس کتاب سے مسلک امام شافعی کی تائید تھی اور مسند امام ابی حنیفہ کے جامع کی غرض اس کتاب سے مذہب امام ابو حنیفہ کی تائید تھی، اس لئے ان میں سے ہر ایک میں اپنے اپنے رنگ کی حدیثیں جمع کی گئی تھیں۔

مگر مسند احمد میں مسلک امام احمد کے موافق و مخالف ہر طرح کی رطب و یابس روایتیں جمع کر دی گئی ہیں اور اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے کہ ہر فرقہ کے موافق بھی کچھ حدیثیں اس میں ملتی ہیں اور مخالف بھی۔

مسند شافعی سے صرف شوافع ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور مسند ابی حنیفہ سے صرف احناف ہی کام نکال سکتے ہیں۔ دوسرے فرقے والے ان کتابوں سے بہت کم مستفید ہو سکتے ہیں۔ مگر مسند احمد سے جس طرح حابلہ مستفیض ہوتے ہیں بالکل اسی طرح شوافع و احناف و مالکیہ بھی۔ اور صوفیہ اور شیعہ کے لئے تو یہاں خزانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ زنادق و ملاحدہ بھی اس کی بارگاہ سے محروم نہیں جاسکتے۔

عزیزیل گوید نصیبہ برم

یہی وجہ ہے کہ مسند شافعی سے احناف کو اختلاف ہو سکتا ہے اور ہے۔ مسند ابی حنیفہ پر شوافع و غیرہم طعن کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ مگر مسند احمد کی پالائش سب کے سب کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ مجموعہ کل حزب بمالد یحکم فرحون کی ایک گنج و غریب تماشگاہ ہے۔ مسند احمد میں چونکہ ہر فرقہ کے موافق بھی روایتیں ہیں اور مخالف بھی، اس لئے ہر فرقہ اس کی بعض حدیثیں لینے کے لئے جس طرح ہاتھ بڑھانا چاہتا ہے اسی طرح بعض کی طرف سے ہاتھ کھینچ بھی لیتا ہے اس کے لئے بات یوں بنائی جانے لگی کہ اس میں کچھ تو حدیثیں خاص امام احمد کی ہیں، وہ تو بالکل صحیح ہیں اور کچھ امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ کے اضافے ہیں۔ ان میں کچھ ضعیف حدیثیں بھی ضرور ہیں اور کچھ حدیثیں عبداللہ بن احمد کے شاگرد ابو بکر قطعی کی بڑھائی ہوئی ہیں۔ جن میں ضعیف ہی نہیں

بلکہ کچھ موضوعات بھی ہیں۔ اس تقسیم کے بعد ہر فرقے کو اس کا موقع مل جاتا ہے کہ جو حدیث اس کے موافق اس ذخیرہ میں ملتی ہے، اس کو وہ خاص امام احمد کی حدیث بتاتا ہو اس کو دانتوں سے پکڑ لیتا ہے۔ اور جو حدیث اس کے مخالف ملتی ہے اس کو عبداللہ کے زیادات یا ابو بکر قطیبی کے اضافے قرار دیکر رد کر دیتا ہے۔

رجال کی چھان بین کرنے والوں کی کافی تعداد دوسری صدی کے اواخر ہی سے پیدا ہو چکی تھی اور یہ فن روز افزوں ترقی پر مدتوں تک رہا۔ مگر باوجود کافی تفحص اور قابل رشک دیانت داری کے مسلکی رجحانات سے آئندہ رجال بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ اور جس طرح امام مالک و امام احمد اور بخاری و مسلم کے شیوخ سے جہاں تک ہو سکا چشم پوشی سے کام لیا گیا۔ اسی طرح ایسے لوگوں کے متعلق بھی عفو و درگزر سے حتی الوسع کام لیا گیا جن سے روایات کا کوئی خاص مقصد وابستہ تھا۔ مثلاً حفص و حمزہ زیات وغیرہما جیوں کے احکام و سنن کی کبھی کوئی روایت معتبر نہیں سمجھی گئی، مگر اختلاف قرأت کی روایتیں ضرور ان سے لے لی گئیں، ورنہ وہ قرأتیں جو ان سے مروی ہیں معدوم ہو جاتیں اور ان کے معدوم ہونے سے قاریوں کے نزدیک قرآن کا ایک حصہ ہی معدوم ہو جاتا۔

اسی طرح سنی و کبلی وغیرہما کہ ہر چند احکام و سنن میں ان جیوں کی کوئی روایت مقبول نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ لوگ بالاتفاق وضاع و کذاب ہیں۔ مگر تفسیری روایتیں کم سے کم بچانے فیصدی انہیں جیوں سے مروی ہیں۔ اگر ان لوگوں کو نامعتبر قرار دے کر ان کی تفسیری روایتیں رد کر دی جائیں تو پھر یہ تفسیر کا ذخیرہ تو بالکل غائب ہی ہو جائے گا۔

بالکل اسی طرح مسند احمد کے دو راوی ابو بکر قطعی جو مسند کی روایت عبداللہ بن امام احمد سے تہنا کر رہے ہیں اور ابن المنذب جو ابو بکر قطعی سے تہنا سند کی روایت کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں غیر مستثن اور حقیقہً ناقابل اعتبار ہیں مگر ان کو ناقابل اعتبار قرار دے کر ان کے واسطے سے جو مسند احمد کا ذخیرہ مل رہا ہے اس کو غیر مستند سمجھتے ہوئے محدثین رد کر دیتے تو پھر ایسی نعمت عظمیٰ جس سے ہر فرقہ کا کام نکل رہا ہو کہاں ملتی، اس لئے جس طرح قرأت کے لئے حفص و حمزہ کو گلے لگانا پڑا اور تفسیری روایتوں کی خاطر سدی و کلبی کے سامنے زانوئے ادب سے کرنے کو گوارا کیا گیا۔ اسی طرح مسند احمد کی ضرورت نے ابو بکر قطعی و ابن المنذب کی پالائش کرنے پر محدثین و ائمہ رجال کو مجبور کر دیا۔

پھر مستدین نے کم از کم اتنا تو اعتراف کیا تھا کہ اس انبار روایات میں بعض موضوع روایتیں بھی ہیں مگر وہ صرف ابو بکر قطعی کے اضافے والی روایتیں ہیں۔ چنانچہ ابن جوزی و علامہ عراقی نے مثلاً بعض روایتوں کو موضوع قرار دے کر پیش بھی کیا تھا مگر بعد والے اس مسند کے ساتھ اس قدر غلو پیدا کر چکے تھے کہ اس کو بھی برداشت نہ کر سکے کہ ابو بکر قطعی پر الزام رکھتے ہوئے بھی اس کتاب میں کسی موضوع حدیث کا وجود تسلیم کیا جائے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ جو خود اپنی

۱۔ ابوالفرج عبد الرحمن بن علی ندوی۔ ولادت ۵۰۸ھ سے ۵۱۰ھ تک کے اندر وقت ۵۵۰ھ

۲۔ حافظ زین الدین عبد الرحیم بن الحسن العراقی ولادت ۴۲۵ھ۔ وفات بروایت صحیحہ ۸۰۶ھ ابن کی کتاب "الغنیۃ المحدث" مشہور و معروف ہے۔

کتاب لسان السیران جلد ۲ صفحہ ۱۳۷ میں ابن المنذب ہی کے ترجمے کے آخر میں ابن المنذب اور ان کے شیخ ابو بکر قطعی دونوں کو غیر متقن قرار دیتے ہوئے امام ذہبی کا قول نقل کر رہے ہیں کہ "اسی لئے مسند احمد میں ایسی ایسی چیزیں واقع ہو گئیں جن کی نہ تو متن ہی محکم ہے نہ استاد ہی۔ انھیں ابن جر نے ابن جوزی و عراقی کے جواب اور مسند احمد کی حملت میں ایک کتاب لکھ ڈالی جس کا نام القول المسند فی الذب عن مسند احمد ہے اس میں ان تمام حدیثوں کو جنھیں ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی موضوع قرار دیا تھا، صحیح نہیں بلکہ بعض کو تو متواتر یا قریب متواتر تک بدعہم خود ثابت کر دکھایا ہے۔"

افنی المکرّم مولانا عبید اللہ الانصاری مدرس سیر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ رحمہ اللہ علیہ کے سامنے بر سبیل تذکرہ ابن جر کی اس بے جا حملت کا ذکر کیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ان میں سے کسی ایک حدیث کو بھی اب پھر کوشش کر کے موضوع ثابت کر دیجئے اور ابن جر کے دلائل کو باطل کر دکھائیے تو میں جانوں، میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ "آپ ہی ان میں سے کسی ایک حدیث کو چن دیجئے۔" بھائی صاحب مرحوم و مغفور نے سد و ابواب المسجد الا باب علی والی حدیث پیش کی کہ اس کو ابن جوزی و عراقی دونوں ہی نے موضوع قرار دیا ہے اور ابن جر نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے اس کو قریب بمتواتر دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے ثابت کر دکھایا ہے۔ آپ ابن جر کے دلائل کو غلط ثابت کر کے اس حدیث کو واقعی موضوع اور حقیقتاً شیعوں کا افتراء ثابت کر دکھائیے۔" بتوفیقہ تعالیٰ میں نے ایک ہفتہ کے اندر خود ابن جر ہی کی کتلوں سے ابن جر کے اقوال و دلائل کی دہجیاں اڑا کر رکھ دیں اور

دکھا دیا کہ یہ حدیث در حقیقت موضوع ہی ہے۔ بھائی صاحب ممدوح میرے مختصر سے رسالے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور بڑی داد دی اور ابن حجر کی اس بے جا حملت پر سخت متاسف ہوئے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ و عفا عنہم۔

استاد مسند احمد

اس مسند کے استاد جہاں کہیں ملتے ہیں اسی سلسلہ روایت سے ملتے ہیں کہ صرف ضیل بن عبد اللہ الرصافی سے اس مسند کو لوگ روایت کرتے ہیں اور ضیل بن عبد اللہ الرصافی تنہا اس کی روایت شیخ ابو القاسم حبیبہ اللہ بن محمد بن عبد الواحد ابن احمد بن الحسن الثیبانی سے کرتے ہیں اور وہ تنہا ابو علی الحسن بن علی بن محمد الشیبی الواعظ عرف ابن المنذم سے۔ وہ تنہا ابو بکر احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک القطعی سے۔ وہ تنہا عبد اللہ بن الامام احمد سے۔ وہ تنہا اپنے والد ماجد امام احمد بن محمد بن ضیل سے یعنی پانچ نسلوں تک اس مسند کو صرف ایک ایک راوی ہی روایت کرتے رہے ہیں۔

مسند احمد کے تمام قدیم و جدید، قلمی و مطبوعہ نسخوں کو دیکھ لیجئے۔ بسم اللہ کے بعد ہی اس کا آغاز خبرنا سے ہوتا ہے۔ یہ خبرنا کہنے والے کون ہیں اللہ ہی کو معلوم ممکن ہے کہ اس جمع یا تشنیہ مستکم میں ضیل بن عبد اللہ الرصافی بھی ہوں۔ مگر ضیل بن عبد اللہ الرصافی اور ابو القاسم حبیبہ اللہ کا حال مجھ کو باوجود جستجو کے رجال کی کسی کتاب میں کہیں نہیں

۱۔ مسند کے موجودہ مطبوعہ مصری نسخے میں جہاں پر عبد الواحد کی جگہ عبد الوہاب لکھا ہوا ہے مگر جہاں تک میں نے تحقیق کی صحیح عبد الواحد ہی ہے۔ واللہ اعلم

ممکن ہے کہ طبقات الخصال وغیرہ میں کہیں مذکور ہوں۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ ضہیل بن عبد اللہ اور ابو القاسم بہت اللہ ان دونوں کے نام وہ اسی مستند ہی کے سلسلہ اسناد میں آتے ہیں۔ اس کے سوا اور کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتے۔ وہیہ مافیہ۔

بہر کیف ان کے بعد ابن المذنب ہی کا نام آتا ہے تو اب ابن المذنب کا حال سنئے۔

ابن المذنب

ابو القاسم بہت اللہ کے شیخ ابن المذنب یعنی الحسن بن علی بن محمد ابو علی بن المذنب الواعظ الشیخی البغدادی۔ ابو القاسم بہت اللہ کی طرح یہ واحد راوی اس پورے ذخیرہ روایات یعنی مکمل مستند احمد کے ہیں۔ بھی تنہا اس مستند کی روایت ابو بکر قطعی سے کرتے ہیں اور ابو بکر قطعی، عبد اللہ سے، وہ اپنے والد امام احمد سے۔

امام ذہبی میزان الاعتدال میں اور ابن جریر لسان المیزان میں ان کا مفصل حال لکھتے ہیں۔ دونوں ہی ان کے متعلق خطیب بغدادی کا قول نقل کرتے ہیں کہ ابن المذنب کا ابو بکر قطعی سے مستند احمد کا سنا تو صحیح ہے مگر پوری کتاب کا نہیں کیونکہ بعض احوار کا سنا ثابت نہیں۔ مگر ابن المذنب نے ان غیر مسعود احمد کو بھی مسعود کے ساتھ ملا لیا تھا اور امام احمد کی کتاب التہذیب کو دیکھ کر اس کی بھی روایت کرنے لگے۔

اگر ذہبی وابن جریر انہیں اور اس سہمت کی محنت تسلیم کریں تو پھر مستند احمد کا جو درجہ کتاب پر جانا ہے۔ اس نے اتنا اعتراف مجبوراً ضروری تھا۔ اس کے بعد مگر پوری کتاب کا نہیں یہ فخر و لوثی و حق کوئی ثابت کرنے کے لئے کھو دینا چاہی تھا۔

حالانکہ اس کا اصل نسخہ ان کے پاس نہ تھا۔ خود اپنے ہی ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے سے روایت کیا کرتے تھے۔

ذہبی و ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابن المذنب ۳۵۵ھ میں پیدا ہوئے اور نواسی سال کی عمر پا کر ۴۴۲ھ میں وفات پائی۔ مسند فضالہ بن عیاض اور مسند حوف بن مالک ابن المذنب کے نسخہ مسند میں نہ تھے۔ اسی طرح مسند جابر کی وہ بعض حدیثیں بھی نہ تھیں، جن کو عراقی نے قطعی سے روایت کیا ہے۔

پھر حافظ ابن حجر، امام ذہبی کا معترفانہ اعتراض نقل کرتے ہیں کہ جب ایک شخص بقیل غطیب کسی کتاب کی روایت کے سلسلے میں اپنا نام جوڑ سکتا ہے تو یہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے، یعنی مسند فضالہ و مسند حوف اور مسند جابر میں کی چند احادیث کا الحاق بھی اپنی طرف سے کر لیا ہوگا۔ (۲)

اتنا لکھ کر پھر حافظ ابن حجر، امام ذہبی کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ شجاع ذہلی نے کہا ہے کہ ابن المذنب روایتوں میں معتمد علیہ نہ تھے۔

۱۔ اس کا اصل نسخہ دنیا میں کہیں نہ

تھا۔ یہ پوری کتاب مجاز ابن المذنب اور ابن کے رفقاء کی تہنیف کردہ تھی، جس کو انھوں نے اپنے ہاتھ سے کھڑے کر امام احمد کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ ابن جریر فرماتے ہیں "اس لئے وہ محلِ محبت نہیں" تو پھر اور کسی کی روایت سے کتاب الزہد محلِ محبت ہو سکے گی؟ دنیا میں ہے کوئی؟ جواہر ابن المذنب کے علاوہ کسی اور کی روایت سے کتاب الزہد کو پیش کر سکے۔

۲۔ حریفی سے مراد ابو شعیبہ محمد بن الحسن طبرانی کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ خود ابن جریر ذہبی کی تصدیقات سے ثابت ہے اور نہ کوئی دوسرا اس لقب کا بھیجے جس کو کہا جائے کہ شاید وہ ہو۔ تفصیل دیکھئے۔

سلفی نے کہا ہے کہ یہ ہمیشہ محل گفت گور ہے کتاب الزہد کے مقدمہ^۲ ہو جانے کے بعد بغیر اصل کتاب کے خود اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ کتاب الزہد کی روایت کیا کرتے تھے۔ خطیب نے کہا کہ ابن المنذب نے ایک ایسی حدیث ملا بکر قطعی سے روایت کی جس کو ان سے ہرگز نہیں سنا تھا۔

اس پر ذہبی نے ابن المنذب کی طرف سے یہ تاویل کی ہے کہ شاید وجاۃ اجازت بخالی ہو (یعنی وہ حدیث کہیں قطعی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہو، یا کسی اور جگہ قطعی کی طرف منسوب نظر آئی ہو اور انہوں نے اسی پالینے کو اجازت قرار دیدی ہو۔ اور حدثنا ابو بکر القطعی مکر روایت کرنے لگے ہوں۔) تو کیا یہ بھی جھوٹ نہ ہو؟

پھر ابن حجر لکھتے ہیں: خطیب بغدادی نے یہ بھی بیان کیا کہ ابن المنذب نے ہم لوگوں سے بواسطہ دار قطنی ووراق و ابو عمرو بن مہدی ایک مرتبہ ایک حدیث محاطی سے روایت کی، تو میں نے کہا یہ حدیث تو ابو عمرو بن مہدی کے پاس نہ تھی۔ تو ابن منذب نے ابن مہدی کے نام پر ہاتھ مار کر کہا کہ بھیری حدیثیں میرے سامنے پیش کی جاتی ہیں جن میں نام غیر منسوب ہوتے ہیں تو میں ان کو اپنی طرف سے منسوب کر لیا

۲۔ کتاب الزہد کا وجود ہی پہلے کہا تھا کہ مقدمہ ہوتی اس کو تو بنیائے عدم سے معاصب وجود پر غریب ابن المنذب ہی پہلے پہل لایا۔ اگر اس کو اپنے نام سے پیش کرتا تو ماننا ہی کون؟ اس لئے بے چارے نے اس کو امام احمد کی طرف منسوب کر دیا۔

اتنی سی بات تھی جیسے افسانہ کر دیا

ورنہ امام احمد کے بعد ان کی اس تصنیف سے ان کے تلامذہ نے ایسی بے اعتنائی کیوں برتی؟ اور یہ چیز مقدمہ کیوں اور کس طرح ہو گئی؟

المنہب کے نسخہ مسند احمد میں مسند جابر کی بعض وہ حدیثیں نہ تھیں جن کو حرانی نے قطعی سے روایت کیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابو بکر قطعی سے حرانی (یعنی ابو شعیب عبداللہ بن الحسن الحرانی) نے بھی مسند احمد کی روایت کی ہے تو قطعی سے مسند احمد کے تنہا راوی ابن المنہب نہ ہوئے بلکہ دوسرے راوی حرانی بھی ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے اس طرح کے داؤ پیچ چالاک محدثین کو خوب آتے ہیں کہ بعض غلط باتیں ضمنی طور سے کسی دوسرے تذکرہ میں کہہ جاتے ہیں تاکہ خارج از بحث بات ہونے کی وجہ سے اس غلط بات کی تغلیط کی طرف کوئی توجہ نہ کرے اور اس طرح وہی غلط آئیندہ کے لئے صحیح بن جائے۔ بعد کو جب بھی بات جو اس وقت خارج از بحث ہے۔ خود موضوع بحث بنائی جائے گی تو یہ تحریر اس وقت ثبوت میں پیش کر دی جائے گی کہ فلاں جگہ اس کا ذکر آچکا ہے۔ اگر یہ بات غلط ہوتی تو اسی وقت اس کی ترویج کی جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ حرانی کا ابو بکر قطعی سے پوری مسند احمد یا اس کے کسی جزء کا بھی بلکہ کسی ایک حدیث کا بھی نہایت کتنا کسی کتاب سے ثابت نہیں۔ خود ابن حجر لسان المیزان جلد ۳ صفحہ ۲۷۱ میں حرانی کا ترجمہ لکھتے ہیں مگر ان کے شیوخ میں ابو بکر قطعی کا نام نہیں لکھتے اور نہ مسند احمد ہی کی روایت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی امید بھی نہیں کی جاسکتی کہ ایک تقریباً نوے برس کا بوڑھا آدمی ایک بائیس برس کے چھوکرے

۱۔ لعجب ہے کہ امام ذہبی اور ابن حجر دونوں ہی ابن المنہب کو مسند احمد کا ابو بکر قطعی سے تنہا راوی بھی لکھتے ہیں، پھر حرانی کو بھی قطعی سے مسند احمد کا راوی بتاتے ہیں۔ اگر دونوں قطعی سے مسند کی روایت کرتے تھے تو پھر ابن المنہب تنہا راوی کس طرح ہوئے؟

۲۔ ابو شعیب الحرانی کے متعلق ابن حجر لسان المیزان میں لکھتے ہیں کہ یہ ۱۵۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۹۵ھ میں ۸۹ برس کی عمر میں وفات پائی۔ ظاہر ہے کہ اس حساب سے ان کی عمر ۸۹ نہیں ہوتی

سے مسند احمد کی سماعت کرنے جائے، دو چار حدیثیں نہیں بلکہ تقریباً ساٹھ ہزار حدیثیں۔ اگر کہا جائے کہ جس سال حرانی جنت کو سدھارے، اسی سال نہیں بلکہ اس سے چند سال پیشتر ان کی اتنی ہمت شاید ہوگئی ہو، تو چند سال پیشتر تو قطعی صاحب اور بھی زیادہ کم سن اور نو عمر ہوں گے اور پھر حرانی نے تو عبداللہ بن احمد کا وقت قطعی سے کہیں زیادہ پایا، بلکہ خاص امام احمد یا عبداللہ ہی سے مسند احمد کی سند لینے میں کیا دشواری تھی جو کم سن چھو کرے غیر مستغنیں سے مسند کی سند لیتے؟

ابو بکر قطعی حرانی کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ بائیس ہی سال کے ہو سکتے ہیں، کیونکہ قطعی کی ولادت ۲۷۳ھ کی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ تو اگر خود قطعی حرانی سے کچھ حدیثیں روایت کرتے، جب بھی شبہ ہوتا کہ انھوں نے تو حرانی کے اختلاط حواس کا زمانہ دیکھا، ان کی سماعت صحیح ہے یا نہیں۔ نہ کہ یہ کہا جا رہا ہے کہ حرانی نے اس کبر سنی میں ایک نوجوان سے دو چار حدیث نہیں بلکہ ساٹھ ہزار حدیثوں کا مجموعہ جا کر

بلکہ اس حساب سے ان کی عمر ۱۳۹ سال ہو جاتی ہے۔ ابن حجرؒ بھی لکھتا ہے کہ احمد بن کامل کا قول ہے کہ حرانی نے ۲۹۲ھ میں وفات پائی۔ اس لئے یقیناً اس کی ولادت ہی غلط ہے۔ غالباً ۲۰۳ھ یا ۲۰۶ھ میں حرانی کی ولادت ہوئی۔ جب ہی ۸۹ سال کی عمر پر ۲۹۲ھ یا ۲۹۵ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ مگر بہر حال یہ عبداللہ بن احمد سے عمر میں بڑے ہی تھے اور خاص امام احمد سے مسند کی روایت کر سکتے تھے اور اگر امام احمد یا عبداللہ کے وقت میں مسند کا وجود ہوتا تو قطعی تو کیا حرانی سے بھی زیادہ مستقیم علیہ محدثین مسند کی روایت خاص امام احمد اور نیز عبداللہ سے کرنے والے دنیا میں مشہور و معروف ہوتے۔

۲۔ ابن المذہب کے ترجمے میں ابن حجرؒ لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۷۳ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ ابن المذہب نے (ایک روایت میں) قطعی کے ساتھ ابو سعید بلونی کا نام بھی بالعمس لگا کر کہا ہے کہ ان دونوں نے کہا کہ ہم سے ابو شعیبہ المروزی نے حدیث بیان کی اور اس سے اتنا معلوم ہو گیا کہ قطعی نے خود حرانی سے حدیث سنی اور روایت لی ہے نہ کہ حرانی نے قطعی سے۔

اول سے آخر تک سنایا سنایا۔ او بالفرض اگر ایسا تھا تو پھر حرانی کے ترجمے میں ابن حجر یا امام ذہبی نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ انھوں نے قطعی سے مسند احمد کی اس بڑھاپے میں سندی۔ یا یہ قطعی سے مسند کی روایت کرتے ہیں۔ پھر ابن سعانی نے بھی اپنی کتاب الانساب میں حرانی کا ترجمہ لکھا ہے، وہ بھی یہ نہیں لکھتے کہ مسند احمد کی یہ قطعی یا کسی سے بھی یہ روایت کرتے ہیں یا قطعی سے حدیث بھی سنی غرض حرانی کا مسند احمد سے دراصل کوئی واسطہ نہیں ہے اور یہ مسند احمد سے بالکل اسی طرح بے خبر ہیں جس طرح دوسرے محدثین جو قطعی سے متقدم تھے، مسند سے بے خبر تھے، اس لئے کہ قطعی کی ولادت سے پہلے مسند احمد کا دنیا میں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

ابو بکر قطعی

احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک بن شعیب ابو بکر القطعی ۲۷۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۶۸ھ میں وفات پائی چونکہ بھی مسند احمد کے تنہا راوی ہیں، اس لئے اگر ان کی توثیق نہ کی جاتی تو پھر ذخیرہ روایات کہیں کا بھی نہ رہتا۔ اسی لئے امام ذہبی نے میزان الاعتدال جلد اول صفحہ ۲۱ میں ان کے ترجمے کے ضمن میں اتنا تو اعتراف کیا ہے کہ ابن الفوارس ان کو حدیث میں کچھ یونہی سا سمجھتے تھے اور مسند احمد کے بارے میں ان کے بعض اصول محل نظر ہیں اور برقانی نے کہا کہ ان کی کتاب کا کچھ حصہ

۱۔ امام ذہبی ہوں یا ابن حجر، مسند کے بھرم کو بہر حال برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس کے خاص اور واحد تہلیل و تہلیل پر مجروح بھی کرتے ہیں تو مسند کو بھانپتے ہوئے۔ مسند پر بھی حرف آتا ہے تو کم سے کم اتنی کوشش رہتی ہے کہ اتنا تو ہو کہ مسند بالکل ہی سرے سے مشتبہ نہ ہو جائے۔ ابن الفوارس کا قول اس طرح نقل کیا ہے، جس سے محل نظر پورا مسند ہی نہ ٹھہر جائے۔ حالانکہ ابن الفوارس پورے مسند ہی کو محل نظر ٹھہراتے ہیں۔

غرق ہو گیا تھا، تو ایک دوسری کتاب جس کے متعلق ان کی سماع نہ تھی، اس سے انہوں نے حدیثیں نقل کر لیں۔ اس وجہ سے محدثین کی ان پر چٹکنیں تھیں، اتنا لکھ کر امام ذہبی لکھتے ہیں کہ: ”ورنہ (یعنی اگر یہ سب باتیں نہ ہوتیں، تو) وہ فی نفسہ ثقہ ہیں۔ پھر خود لکھتے ہیں کہ: ”ورنہ (خود ان سے سخت متفر اور بے حد عفا تھا۔ مگر معلوم ہو گیا کہ انہیں یہ سچے آدمی ہیں، ان کی سماع میں شک نہیں کیا جاسکتا۔ اور میں نے سنا ہے کہ وہ بحباب الدعویٰ بھی تھے۔“ ان کی توثیق کی اتنی کوشش صرف مسند احمد کا بھرم رکھنے کے لئے ہے، چنانچہ ابن حجر، امام ذہبی کی اتنی

۱۔ وہ دوسری کتاب کس کے پاس تھی اور جس کے پاس تھی اس نے کہاں سے حاصل کی تھی؟ اور پھر وہاں صرف ابو بکر قطیبی کو اپنی کتاب درست کر لینے کا موقع ملا اور کسی کو وہاں سے مسند کی اجازت یا نقل کا موقع کیوں نہ مل سکا، اور پھر اس شخص نے خود مسند کی روایت کیوں نہ کی۔ اگر عبد اللہ بن احمد سے اس کو وہ کتب ملی تھی تو پھر قطیبی ہی جناب عبد اللہ سے مسند کے راوی نہ ہوئے۔ وہ بھی تو ایک ہوا اور اگر اس کو امام احمد ہی سے مسند ملی تھی جب تو بڑی چہن ہوئی۔

۲۔ محدثین کی چٹکنیں تو دراصل اس مسند احمد کے اختراع و اختلاق ہی کی وجہ سے تھیں مگر برقانی نے پردہ ڈالنے کیلئے کچھ حصہ کتب کے فرق ہو جانے کو چٹمک کا سبب قرار دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے معصروں نے ان سے مسند احمد کے اصل نسخہ کا مطالبہ کیا تو انہوں نے کہا اظاں سفر میں عرق ہو گیا، تو میں نے اپنی یاد سے اور کچھ ردی پرزے پر جو مسودہ تھا اس سے مرتب کر لیا، اسی لئے ان کے معصروں نے اس مسند کو مشکوک قرار دیا اور ان پر چٹکنیں ہونے لگیں۔ اتنے بڑے اہم واقعہ کو برقانی نے کس قدر ہلکا کر دکھایا، صرف مسند احمد کا بھرم رکھنے کے لئے۔

۳۔ کس ذریعے سے معلوم ہوا؟ اس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی مگر مجھ کو وہ ذریعہ معلوم ہے یعنی یہی کہ دوسرے معصروں محدثین نے کہا اگر ان کی سماع کو مستحبر نہیں مان لیتے ہیں تو مسند احمد جیسا ذخیرہ روایات ہاتھ سے جاتا ہے اس لئے جس طرح ہم لوگوں نے ان کی سماع صحیح مان لی ہے تب بھی مان لیتے اور اس متفر اور غلطی کو دور کیجئے اور پھر مسند کے پردہ پاغٹڈا کرنے والوں نے قطیبی کے دلی اور مواجب الدعوات ہونے کا بھی پردہ پیغٹڈا کر رکھا تھا۔

عبدت نقل کر کے لسان المیزان جلد ۱ صفحہ ۱۴۵ میں لکھتے ہیں کہ - ذہبی نے جو ابن فرات (کی جرح) پر انکار کیا ہے، اس سے تعجب ہے۔ کیونکہ ابن فرات ہی کچھ اس (جرح) میں منظرِ دہنیں ہیں بلکہ خطیب نے بھی اس کو احمد بن الحسبی کے ترجمہ میں لکھا ہے۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ - اور ذہبی سے تعجب ہے کہ ابن الفرّات کے قول کی تو (ہاں) تردید کرتے ہیں مگر (انھیں قطعی کے شاگردِ خاص) حسن بن علی الحسبی (ابن المنذّب) کے ترجمے کے آخر میں خود لکھتے ہیں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ ابن المنذّب ایک غیر متقن شیخ تھے، اور انھیں کی طرح ان کے شیخ ابن مالک (القطعی) بھی اور اسی وجہ سے مسند احمد میں ایسی چیزیں واقع ہو گئی ہیں، جن کی نہ تن ہی درست ہے نہ اسناد ہی، واللہ اعلم۔

غرض ذہبی اور ذہبی سے زیادہ ابن حجر، قطعی سے بالکل مطمئن نہیں ہیں، مگر دونوں ہی مسند کی وجہ سے مجبور ہیں۔ اس لئے باوجود ولی متفر کے کسی نہ کسی حد تک قطعی کی توثیق ضرور کئے جاتے ہیں تاکہ مسند احمد کا بھرم رہ جائے۔ اگر مسند کا خیال نہ ہوتا تو اللہ جانے یہ لوگ قطعی اور ابن المنذّب دونوں کے متعلق کیا کیا لکھتے۔

قطعی کے شیوخ دراصل قطعی کے شیوخ نہ تھے

قطعی کے شیوخ میں عبد اللہ بن احمد کے سوا تین چار امام اور بھی ائمہ رجال نے لکھے ہیں۔ جن میں اکثریت وضاعین و کذابین ہی کی ہے۔ مثلاً محمد بن یونس السامی الکدیی وغیرہ، مگر تعجب یہ ہے کہ جہاں ان لوگوں کے مکاذہ کی فہرست ہے، وہاں قطعی کا کوئی ذکر نہیں اور نہ قطعی

کی اتنی عمر ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں سے یہ حدیثیں سنیں اور روایتیں اخذ کر سکیں۔ البتہ قطعی کے حقیقی استاد اور رفیق مذہب و مسلک ابو بکر شافعی کا نام ان لوگوں کے ملازمہ میں آتا ہے۔ جس طرح عبداللہ بن احمد کے ساتھ بھی دراصل ابو بکر شافعی ہی رہے اور ان کے ساتھ بچوں کی طرح یہ قطعی صاحب بھی لگے لئے رہتے تھے۔ ان کو جو کچھ بھی ملا ابو بکر شافعی ہی سے ملا۔ مگر یہ درمیان سے ابو بکر شافعی کا نام اڑا کر اپنی نسبت کو بلا واسطہ ابو بکر شافعی کے شیوخ سے جوڑ دیا کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے اکثر شیوخ ایسے ہی ہیں جو ان کی کم سنی یا آغاز شباب ہی کے وقت دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ غرض یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ دراصل قطعی کے استاد و شیخ جو کچھ بھی تھے صرف ابو بکر شافعی ہی تھے اور کوئی بھی نہ عبداللہ بن احمد نہ کوئی اور جس کی تصریح آگے ابو بکر شافعی کے ترجمہ میں آتی ہے۔ سلسلہ قائم رکھنے کے لئے ابھی عبداللہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

عبداللہ بن امام احمد بن حنبل

ان کی ولادت ۲۱۳ھ کی ہے اور ۲۹۰ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ حضرت امام احمد کی وفات ۲۴۱ھ میں ۱۲ ربیع الاول کو ہے یعنی تقریباً آغاز سال ہی میں اور عبداللہ کی پیدائش ۲۱۳ھ کے وسط میں ہے، اس لئے امام احمد کی وفات کے وقت عبداللہ زیادہ سے زیادہ ۲۷ برس کے تھے۔

ابو بکر قطعی کی عمر عبداللہ کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ ۱۷ سال کی ٹھہرتی ہے۔ اس لئے اسی قدر پتا مل سکتا ہے کہ یہ چند سال عبداللہ بن امام احمد کی خدمت میں شاید رہے ہوں مگر اس عمر میں ساٹھ ہزار حدیثوں کے مکمل مجموعے کا سننا اور اخذ کرنا بالکل خلاف عقل ہے کوئی صاحب انصاف اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

قطعی در اصل ابو بکر شافعی کے چیلے تھے

البتہ یہ بچپن ہی سے ابو بکر شافعی کے ساتھ لگے بہتے تھے اور ابو بکر شافعی، عبداللہ بن احمد کے شاگردوں کی جماعت میں داخل ہو گئے تھے۔ عبداللہ اور ابو بکر شافعی کی وفات کے بعد یہ بذات خود عبداللہ بن احمد سے تلمذ کے مدعی ہو گئے۔ اس لئے لوگوں نے ابو بکر شافعی کے ساتھ ان کو بھی عبداللہ بن احمد کے ملازمہ میں شمار کر لیا اس وقت مسند احمد کا کوئی وجود تو تھا نہیں کہ واقعی مسند احمد کو کوئی عبداللہ سے سنتا یا ان کو سناتا اور لوگ یہ خیال کرتے کہ ان کی عمر عبداللہ کے وقت میں اتنی تھی یا نہیں کہ ساٹھ ہزار روایات کا مجموعہ یہ عبداللہ سے اخذ کر سکیں۔

قطعی نے عبداللہ بن احمد کا وقت نہیں پایا

ان کے ادعائے تلمذ سے بے حد میں لوگ اسی قدر کچھے کہ کچھ حدیثیں شاید آخر وقت میں عبداللہ بن احمد سے سنی ہوں گی، اس وجہ سے یہ تلمذ کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ خواجواہ اتنی سی بات کو جھٹلاتا جس کے امکان کا قرینہ بھی موجود تھا۔ ہاں اگر یہ عبداللہ بن احمد کے مشہور ملازمہ کے سامنے مسند احمد کا نام لیتے، جب البتہ اکابر محدثین ان کی خبر لینے کو تیار ہو جاتے اور پوچھتے کہ مسند احمد کس جانور کا نام ہے اور تم کہاں سے لائے؟ ہم لوگوں کو تو یہ نعمت عظمیٰ عبداللہ سے نہ ملی جو برسوں عبداللہ کی خدمت میں رہے اور ساری زندگی حدیث کی خدمت میں گزاری اور گزار رہے ہیں۔ اور تم کو ہم سب لوگوں سے چھپا کر بلا کسی

استحقاق کے عبداللہ بن احمد نے اتنی بڑی دولت چپ چاپ سوئپ دی
آخر تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے تھے۔

یہ مسند احمد کب اور کس طرح وجود میں آئی، اس کی تفصیل آگے آتی
ہے۔ خاص مسند احمد کے ذکر میں۔ ابھی سلسلے کی آخری کڑی یعنی احمد
بن محمد بن حنبل کا مختصر سا ترجمہ سن لیجئے۔

امام احمد بن محمد بن حنبل

ان کی ولادت ۱۶۳ھ میں اور وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی، ۷۷ سال کی عمر
پائی۔ امام شافعی، ابن مہدی، ابو الولید، عبدالرزاق، وکیع، یحییٰ بن آدم
اور یزید بن ہارون سے یہ خود بھی روایت کرتے ہیں اور یہ لوگ بھی ان
سے روایت کرتے ہیں، یعنی یہ سات آدمی ان کے شاگرد بھی ہیں اور
استاد بھی۔ اور قتیبہ داؤد بن عمر، اور خلف بن ہشام ان سے عمر میں
بڑے تھے، مگر ان کے مکالمہ میں تھے۔ اور احمد بن الحواری، یحییٰ بن
معین، علی بن المدینی، حسین بن منصور، زیاد بن ایوب ابو قدامہ
السرخی، محمد بن رافع، محمد بن یحییٰ بن ابی سمیہ اور عبدالرحمان بن
ابراہیم جن کا لقب رحیم تھا یہ نو آدمی ان کے اقران میں سے اور ان
کے خاص شاگرد اور خود بلند پایہ محدثین میں سے تھے۔ اور عبداللہ اور
صالح ان کے دونوں صاحبزادے بھی ان کے خاص شاگرد تھے۔ ان
اکابرین محدثین کے علاوہ ابو بکر الاثرم، یحییٰ بن مخلد، حرب الکرمانی،
حنبل بن اسحق، شاہین بن السمیع اور میمون بھی ان کے مشہور مکالمہ
میں سے تھے۔ پھر امام بخاری، امام مسلم اور ابو داؤد بذات خود بلا واسطہ
بھی ان سے روایت کرتے ہیں اور بواسطہ ابو عبدالرحمان اسود بن عامر

الشافعی لقب بہ شاذان بھی۔ امام احمد کے آخری شاگرد، جو ابو امام احمد کے بعد عبداللہ بن احمد کے بھی شاگرد ہوئے۔ مشہور محدث ابو القاسم البغوی ہیں۔ اور ان بزرگوں کے علاوہ ایک جماعت کثیر امام احمد کے ملامہ میں ہے جن میں سے بہتروں کے نام ہتھب الہتھب وغیرہ کتب رجال میں مذکور ہیں۔

سلسلہ اسناد کے تمام افراد کو جان لینے کے بعد اب خاص مسند احمد کے وجود اور اس کی نوعیتوں پر غور فرمائیے۔

مسند احمد

اب یہ چیز ہر صاحب عقل بغیر ذہن پر زور ڈالے سمجھ سکتا ہے کہ اگر امام احمد بن حنبل اپنی زندگی میں کوئی مجموعہ اپنی حدیثوں کا قلم بند کر جاتے یا اپنے صاحبزادے عبداللہ سے لکھواتے تو جس طرح امام مالک سے ان کی مؤطآن کے سینکڑوں شاگردوں نے سنی، اور ہر سننے والا ان سے مؤطا کی روایت کرتا تھا۔ اسی طرح امام احمد کے مسند کو بھی عبداللہ کے علاوہ ان کے دوسرے ملامہ بھی ضرور امام احمد سے سنتے اور اس کی روایت کرتے۔ اتنے بڑے بڑے محدثین، جو نہ صرف امام احمد کے شاگرد تھے، بلکہ استاد بھی تھے، یا خاص اقران میں تھے، یا عمر میں بڑے تھے یا اپنے علم و فضل کی وجہ سے علم حدیث میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے، باوجود اس کے کہ یہ سب کے سب امام احمد کے شاگرد تھے، آخر یہ سارے کے سارے اس ضخیم مسند کے وجود سے بالکل بے خبر کیوں رہے اور امام احمد نے ان سب کے سب سے اپنی اس کتاب کو پوشیدہ کیوں رکھا، یہاں تک کہ اپنے دوسرے بیٹے صالح کو بھی اس نعمت عظمیٰ سے بالکل محروم ہی رکھا تعجب ہے کہ امام بخاری اپنی تاریخ میں امام احمد

ذکر خیر کرتے ہیں، مگر نہ مسند کا کوئی ذکر فرماتے ہیں نہ کتاب الزہد کا۔ آخر امام احمد کو کیا ہو گیا تھا کہ اشاعت حدیث و اشاعت دین کے عوض اپنے جہانم شاکر دوں سے بالکل کتمان حدیث و کتمان علم فرمایا اور صرف اپنے ایک ہی صاحبزادے عبداللہ کو اس کتاب مکتون کا محرم راز بنایا۔ آخر دوسرے لوگوں سے اخفاء و کتمان کی کیا ضرورت پڑی؟ کیا ان کے تلامذہ میں سے عبداللہ کے سوا کوئی بھی اس امانت عظمیٰ کا امین نہیں ہو سکتا تھا۔

عبداللہ کے تلامذہ ابو القاسم البغوی

اسی طرح عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں ابو القاسم البغوی جن کی ولادت ۲۱۳ھ کی ہے یعنی عبداللہ سے ایک سال بڑے ہی تھے اور محاص امام احمد کے آخری شاگرد تھے یعنی عبداللہ کے خواجہ تاش استاد بھائی بھی تھے اور شاگرد بھی۔ اور خود مشہور بلند پایا محدث تھے ۳۱۷ھ میں عبداللہ بن احمد کے ستائیس سال بعد وفات پائی۔

سلیمان بن الطبرانی

سلیمان بن حرب احمد بن ایوب اللیٰ الطبرانی جن کی ولادت ۲۶۰ھ کی اور وفات ۳۶۰ھ میں ہے۔ پورے سو برس کی عمر پائی، عبداللہ کی وفات کے وقت تیس برس کے تھے۔ اور قطعی سے تیرہ سال بڑے تھے اور بقول ابن حجر ۱۳ سال کی عمر سے حدیثیں سننے لگے اور برابر عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگے رہے۔

احمد بن کامل بن شجرہ

احمد بن کامل بن شجرہ القاضی البغدادی، ان کی ولادت بھی ۲۶۰ھ ہی کی ہے۔ نوے سال کی عمر پا کر ۳۵۰ھ میں راہی جنت ہوئے، ابن جر نے ان کو من لوعیة للعلم (علم کا ظرف) لکھا ہے۔

محمد بن مخلد

محمد بن مخلد بن حفص، جنہوں نے کافی عمر پا کر ۳۳۱ھ میں وفات پائی۔ دار قطنی جیسے مشہور محدث کے شیوخ میں تھے اور قطیعی سے کافی بڑے تھے عمر میں بھی اور علم و فضل میں بھی۔ ابن جر ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ اپنے وقت میں سب سے بڑے عالم تھے۔ وغیرہم۔

غرض ایسے ایسے تلامذہ کے ہوتے ہوئے عبداللہ بن احمد کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ اسی کتاب مکنون مسند احمد جس کو امام احمد نے اپنے تمام شاگردوں سے چھپا کر صرف انہیں کو بطور ایک پوشیدہ راز کے عطا فرمایا تھا۔ ایسی نعمت عظمیٰ کو انہوں نے بھی اپنے تمام شاگردوں سے چھپا کر بلا استحقاق دیا بھی تو صرف ایک سترہ سال کے چھوکرے ابو بکر قطیعی کو!

تغور تو اے چرخ گرداں تغور!

جس طرح امام احمد نے اپنے دوسرے تمام تلامذہ سے حتیٰ کہ اپنے دوسرے بیٹے سے بھی اس مسند کو پوشیدہ رکھا بالکل اسی طرح عبداللہ نے بھی اپنے تمام شاگردوں سے باپ کی دی ہوئی نعمت کو پوشیدہ ہی رکھا اور

ایک گھر سے باہر کے کم عمر چھو کرے کے حوالے کر دیا

امام احمد کو تو شاید اولاد کی محبت نے اس راز داری پر مجبور کر دیا ہو اور دوسرے بیٹے سے شاید وہ کچھ غصے بہتے ہوں، اس لئے اپنی ساری عمر کی کمائی صرف ایک ہی بیٹے کو دے گئے اور دوسرے کو بالکل محروم کر دیا۔ مگر یہ ابو بکر قطعی جیسے سترہ سال کے چھو کرے سے عبد اللہ کو کون سا رشتہ محبت تھا کہ عبد اللہ نے اپنے تمام برابر والے اور علم و فضل میں مستند شاگردوں میں اس چھو کرے کو ترجیح دی اور سب کو اس نعمت سے محروم ہی نہیں، بلکہ بالکل بے خبر رکھا، کسی سے کہا تک نہیں کہ میرے پاس والد ماجد کی ایک کتاب ہے۔

پھر ابو بکر قطعی کے ملازمہ میں بھی ابن المذنب کے علاوہ کچھ لوگ مثلاً حافظ ابو نعیم احمد بن عبد اللہ بن اسحق صاحب حلیۃ الاولیاء اور علی بن الحسن الصقلی القزوی وغیرہ بھی تھے، مگر ابن المذنب کے سوا کوئی دوسرا شخص اس مسند کی روایت نہیں کرتا، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ ابن المذنب کے بھی دو چار شاگرد ضرور ہونگے مگر ابن المذنب سے بھی صرف ابو القاسم بہتہ اللہ ہی تنہا اس کی روایت کرتے ہیں اور کوئی دوسرا نہیں۔

اور ابو القاسم بہتہ اللہ صاحب کے بعد صرف حنبل بن اسحق الرضائی ہی اس کو لئے پھرتے ہیں، یعنی چھٹی پشت سے اس مسند کی روایتی نسل کی چھوٹی چھوٹی شاخیں پھوٹنا شروع ہوتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ ادھر ادھر پھیلنے لگتی ہیں مگر پانچ پشت اوپر تک برابر مکمل راز داری اور پورے

اخفا و کتمان کے ساتھ ایک ایک ہی شخص ہر دور میں اس مسند کا تنہا راوی چلا آتا ہے۔ اگر کوئی حدیث اس طرح کی ہو جس کا راوی مسلسل ہر عہد میں ایک ایک ہی شخص رہا ہو، اور وہ بات ایسی ہو جس کے جاننے والوں کے تعدد کو عقل چاہتی ہو تو ایسی حدیث آحاد قرار دے کر ضعیف اور ناقابل احتجاج قرار دے دی جاتی ہے اور یہاں ساٹھ ہزار حدیثوں کا پورا مجموعہ پانچ پانچ دور تک ایک ایک ہی شخص کی وساطت سے چلا آ رہا ہے مگر کسی محدث کے منہ میں نوبان نہیں کہ اس پورے مجموعے کو آحاد کہہ کر ٹھکرا دے، خصوصاً جب اس کے دو آخری راوی بالکل بجهول الحال ہیں اور اس کے اوپر کے دور راوی ابن المنذب اور ابو بکر قطعی غیر مستحق اور ناقابل احتجاج۔

سلسلہ مسند کی اصلی اور ابتدائی مگر پوشیدہ کڑی ابو بکر شافعی

عبد اللہ بن احمد کے تلامذہ میں ابن حجر اور حماد ائمہ رجال ابو بکر شافعی کا نام لکھتے ہیں اور یہ ضرور عبد اللہ بن احمد کے ساتھ کچھ مدت تک لگے لیے رہے ابن حجر ان کا مطلق ذکر ہی نہیں کرتے۔ البتہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۹۱ میں ان کا ترجمہ سپرد قلم فرمایا ہے، مگر افسوس کہ وہ ان کی حقیقت حال تک نہ پہنچ سکے اور نہ ان کو کوئی خاص ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے متعلق اتنی کرید کرتے۔ ابن حجر غالباً ان کی حقیقت سے واقف ہو گئے تھے، اس لئے ان سے قطع نظر ہی کرنا مناسب سمجھا۔ نہ جہنم البہتہب میں ان کا ذکر کیا نہ لسان المیزان میں نہ تقریب میں۔ نہ تعجیل المنفعہ میں۔ تعجب یہ ہے کہ دو جلیل نے بھی

الاسماء والکنی میں ان کا ذکر نہ کیا۔ البتہ سمعانی نے ان کو کتاب الانساب میں یاد کیا ہے۔ لکھا ہے کہ یہ مقام حلی میں پیدا ہوئے اور بغداد میں سکونت اختیار کی۔ اس لئے حلی بھی اپنے آپ کو لکھتے ہیں اور بغدادی بھی، یعنی کبھی یہ کبھی وہ، عمر زیادہ پائی، یہاں تک کہ دار قطنی نے بھی ان سے روایت کی ہے۔ لکھا ہے کہ ابو علی بن شاذان وغیرہ نے ایک بار مسجدوں میں سب صحابہؓ لکھا ہوا پایا، تو فوراً انھوں نے اپنی برأت کے لئے لوگوں کو فضائل صحابہؓ لکھوانا شروع کیا۔ ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے ۳۵۳ھ میں مرے۔ دار قطنی وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے۔

محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن ثابت ابو بکر بغدادی

ابن حجر نے لسان المیزان جلد ۵ صفحہ ۲۲۸ میں محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن ثابت ابو بکر بغدادی کا ترجمہ لکھا ہے۔ اور لکھا ہے کہ ان کو زعم تھا کہ یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبل سے یہ روایت کرتے ہیں مگر دار قطنی نے ان کو دجال کہا ہے، اور خطیب نے لکھا ہے کہ یہ حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ مجھے تو اس کا شبہ سا ہوتا ہے کہ یہ حضرت ابو بکر شافعی ہی ہیں۔ دار قطنی کی توثیق و روایت کا ذکر جو سمعانی نے کیا ہے وہ کسی محترم ذریعے سے سمعانی تک نہیں پہنچی ہوگی۔ واللہ اعلم۔ اس لئے کافی نقص و جستجو کر کے میں جس صحیح نتیجے پر پہنچا ہوں، وہ حسب ذیل ہے۔

موسیٰ بن سہل الوشاء

ابو بکر شافعی ۳۶۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۵۴ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کے سب سے پہلے استاد موسیٰ بن سہل الوشاء شافعی تھے،

جن کو عقلی نے غیر مشہور دار قطنی نے ضعیف اور برقانی نے قطعی ضعیف لکھا ہے، ابن علیہ کے سب سے آخری شاگرد تھے۔ ۲۷۸ھ میں وفات پائی۔

محمد بن شداد المستملی

جب ابو بکر شافعی موسیٰ بن سہل کی آغوش تربیت سے بقضائے الہی محروم ہو گئے تو محمد بن شداد المستملی کی گود میں آگرے اور ان سے تعلیم پانے لگے۔ ان کو بھی برقانی نے ضعیف، امام ذہبی نے معزنی اور منکر الحدیث اور دار قطنی نے ضعیف و ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔

در حقیقت ابو بکر شافعی کی پوری دماغی پرورش انہی دونوں کی آغوش تربیت میں ہوئی۔ ۲۶۰ھ میں ابو بکر شافعی پیدا ہوئے اور ۲۷۲ھ سے وصال کی خدمت میں پہنچے لگے، یعنی ۱۲ سال ہی کی عمر سے۔ گزشتہ دو اساتذہ کے علاوہ محمد بن سعید البورقی کے بھی یہ شاگرد رشید ہیں۔

محمد بن سعید البورقی

یہ بورقی صاحب وہی ہیں، جو سلیمان بن جابر سے روایت کرتے ہیں اور مشہور و معروف وضاع ہیں یعنی جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے۔

محمد بن یونس الکدی

اور پھر محمد بن یونس الکدی، جو جانے بوجھے کذاب اور افتا پرداز ہیں، ان کے بھی ہنایت خاص شاگرد ہیں اور اسی قسم کے۔

ابو بکر شافعی کے بعض دوسرے شیوخ

چجد اور مثلاً محمد بن حزمین، بن نصر اور ابو جعفر الترمذی، اسحق بن ابراہیم بن سنین الحنفی جن کی کتاب الدیباچ مشہور ہے۔ محمد بن ہارون برسیہ الباشمی، سعید بن ہاشم النظیری، ابو عمارۃ محمد بن احمد بن مہدی، محمد بن الحسن بن محمد بن سماء الحصری، ابراہیم بن اسمعیل المسعی البصری، اور انھیں جیسے بعض دوسرے مجروحین و متروکین و ضعفا کے حلقہ فیض سے یہ استفادہ کرتے رہے۔

مگر در حقیقت یہ بورقی اور کدی کی تیار کردہ ایک پوشیدہ پارٹی تھی، جو ایک پوشیدہ گہری سازش کے ماتحت باہم تقسیم اسمائے صحابہ و اکابر تابعین کر کے ان کے ناموں سے موضوعات کا انبار لگا رہی تھی اور اس کے لئے ابو بکر شافعی تیار کئے گئے تھے کہ یہ عبداللہ بن احمد کے پاس آیا جایا کریں اور ان کے کلامہ کی فہرست میں اپنا نام لکھوالیں تاکہ عامہ محدثین ان کو عبداللہ کا شاگرد جان جائیں۔

یہ باوجود عبداللہ بن احمد کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے کے حنفی نہ بنے بلکہ شافعی بنے رہے اور اپنے کو حنفی نہیں بلکہ شافعی مشہور کیا تاکہ دونوں فرقوں سے تعلقات رہیں۔ مگر یہ ابو بکر شافعی دراصل امامی شیعوں تھے۔

ابو بکر شافعی دراصل شیعوں تھے۔

اور تقیہ اپنے کو شافعی مشہور کئے رہے اور تقیہ ہی کر کے عبداللہ بن احمد کے شاگرد بھی بنے تھے۔ اب اس دعوے کی دلیل اور احوال کی تفصیل یوں سنئے۔

تذکرۃ الحفاظ میں ابو بکر شافعی

ان ابو بکر شافعی صاحب کا پورا نام امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں یوں تحریر فرماتے ہیں دیکھئے جلد ۳ صفحہ ۹۱ محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ البغدادی، انھوں نے اہل سنت کو دھوکہ دینے کے لئے جس طرح مسلک شافعی بظاہر اختیار کر کے اپنے ساتھ شافعی کی نسبت کو شہرت دے رکھی تھی، اسی طرح اپنی اصلی کنیت جو ابو الحسن تھی، اہل سنت کو دھوکا دینے کے لئے ابو بکر سے بدل کر مشہور کر رکھی تھی اور اسی طرح ابو بکر شافعی ہی کے لقب سے مشہور و متعارف رہے۔ یہ بھی خوب یاد رکھئے کہ ان کے پردادا کا اصلی نام کسی نام کے بعد ح کی علامت جو بنی ہوتی ہے ممدوح کا مخفف ہے۔ خود مصنفین کتب رجال شیعہ نے اس کی تصریح کر دی ہے۔ دیکھئے وجیزہ صفحہ ۱۹۳

ابو بکر شافعی کے عوض ابو بکر القسانی

مگر اسی رسالہ کے باب الکنی میں ابو بکر شافعی کے عوض - ابو بکر القسانی - لکھ کر وہی علامت ح کی بنا دی ہے، جو ان کے نام کے ساتھ بنائی ہے۔ اور ابو بکر شافعی کا ذکر باب الکنی میں نہیں کیا۔

شرح تصریحات علمائے شیعہ

علامہ حلی اور صاحب منتہی المقال نے ابو بکر شافعی کی نشان دہی کی - مگر علامہ مجلسی نے نام کی تصریح تو کی، مگر کنیت کا مطلق ذکر ہی نہ کیا صاف کھا گئے۔ اور ابو بکر شافعی کے عوض ابو بکر القسانی لکھ کر اس طرح

اس پر پردہ ڈالا کہ کسی کا ذہن ہی نہ جائے کہ یہ ابو بکر شافعی ہی ہیں اور ان تینوں نے مل کر ابو بکر شافعی کے باپ کا نام یعنی عبداللہ کو درمیان سے بالکل غائب ہی کر دیا یا ممکن ہے کہ ابو بکر شافعی نے خود ہی تقیہ کے ماتحت اہل سنت کو اپنا سلسلہ نسب بتانے میں ایک نام عبداللہ کا بڑھا دیا ہو۔ واللہ عالم۔ پھر کوئی تو محمد بن ابراہیم بن یوسف لکھتا ہے اور کوی صرف محمد بن یوسف۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ خود صاحب مفتی المقاتل نے یہ کتھی اس طرح سلجھا دی کہ کوئی ان کو ان کے باپ کی طرف منسوب کرتا ہے اور کوئی ان کے دادا کی طرف مگر ان کے دادا یا پردادا کا لقب جو عبدویہ انھوں نے خود دے رکھا تھا، اس کو ان میں سے کوئی بھی نہیں لکھتا۔ تمنا یہ ہے کہ سال وفات کا بھی مطلق ذکر نہیں کیا جاتا۔ صرف علامہ حلی سال ولادت لکھتے تو ہیں مگر متعارف طریقہ جو سال ہجری کا ہے اس سے گزیر کر کے ایک بالکل غیر متعارف چیز یعنی حسینی کے حساب سے نام یوسف تھا، مگر انھوں نے عبدویہ لقب دے کر اہل سنت میں مشہور کیا اسی لئے شیعوں کی بعض کتب رجال میں ان کا نام یوں ہے۔ محمد بن ابراہیم بن یوسف۔

۱۔ سال حسینی کا محل مجھ کو ابی الاظم حضرت مولانا قاری شہ محمد سلیمان پھلواری سے او۔ ان کو نواب حسن الملک سے معلوم ہوا کہ جماعۃ اللہ تعالیٰ میں نے اس کی پوری تفصیل لہنے رسالے آپہ استفسار میں لکھ دی ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے اس کا اعادہ ضروری نہیں سمجھتا ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ اس کا آغاز بعثت نبوت سے آٹھ سال پیشتر سے ہل قشع کرتے ہیں اور جس کی بنیاد ایک خواب بتاتے ہیں، جو شیعوں کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امام حسین کے متعلق بعثت سے آٹھ سال پہلے دکھایا گیا تھا اور ان کے یہاں اس خواب کا اخفا و کتمان بھی فرض ہے اور سال حسینی کا اخفا بھی۔ مگر زندہ گی بھر میں واقف کاروں پر وہ ایک مرتبہ اس کا استعمال بھی واجب ہے۔ غالباً اسی بناء پر علامہ حلی نے یہاں استعمال کر لیا۔

الکاتب یعنی ابوالحسن "جیسا کہ" خلاصۃ الاقوال میں علامہ حلی مشہور محدث شیعہ نے لکھا ہے اور اس طرح ان کا نام تحریر فرما کر لکھتے ہیں کہ "قال احمد بن عبدون هو ابو بکر الشافعی مولده سنہ ۲۸۱ الحسینیہ و کان علی الظاہر یتفقہ علی مذهب الشافعی و یری رای الشیعہ الامامیہ فی الباطن و کان نقیضاً علی المذہبین ولہ علی المذہبین کتب یعنی احمد بن عبدون نے فرمایا کہ وہ ابو بکر شافعی ہیں ان کی ولادت حسینی سال کے حساب سے ۲۸۱ میں ہوئی اور یہ بظاہر مذہب شافعی کی فقہ پر تھے، مگر باطن میں شیعہ امامیہ کا عقیدہ رکھتے تھے اور دونوں مذہب کے فقیہ تھے اور دونوں مذہب پر ان کی کتابیں ہیں۔ دیکھئے خلاصۃ الاقوال صفحہ ۷۰،

منہ المقال میں ابو بکر شافعی

اور دوسرے شیعہ محدث امام فن رجال ابو علی محمد بن اسماعیل بن عبد الجبار اپنی کتاب منہ المقال میں لکھتے ہیں کہ "ابو بکر الشافعی هو محمد بن یوسف، کذا فی المجمع فلعلہ ینسب تارۃ الی ابیہ و تارۃ الی جدہ و ذکرہ من طبقہ ثقاتہم۔ یعنی ابو بکر شافعی وہ محمد بن یوسف ہیں۔ ایسا ہی کتاب الجمع میں ہے۔ شاید ان کی نسبت کبھی ان کے باپ کی طرف کی جاتی ہو اور کبھی ان کے دادا کی طرف۔ یعنی کسی نے محمد بن ابراہیم کہا کسی نے محمد بن یوسف کہہ دیا۔ اور لوگوں نے ان کو

۱۔ یعنی محمد بن ابراہیم بن یوسف الکاتب جن کی کنیت ابوالحسن ہے جیسا کہ ابتدائے ترجمہ میں علامہ حلی نے لکھا ہے۔

تھہ لوگوں کے طبقے میں ذکر کیا ہے۔

علامہ مجلسی کی الوجیزہ

علامہ مجلسی تیسرے مشہور شیعہ مجتہد و محدث اپنی کتاب الوجیزہ میں لکھتے ہیں۔ محمد بن ابراہیم بن یوسف ح۔ شیعوں کی کتب رجال میں جس سے علمائے اہل سنت تو کجا شیعوں میں سے بھی خاص خاص ہی لوگ واقف ہیں۔ اس طرح کی تدلیس یعنی ناموں میں ادل بدل شیعی علماء بہت کیا کرتے ہیں کہ علمائے اہل سنت اگر یہ کہیں کہ یہ تو شیعہ ہے، تو جواب میں کہدیا جائے کہ نہیں تو، شیعہ تو دوسرا ہے، جس کے بار میں آپ کہتے ہیں وہ سنی ہے، چنانچہ دونوں کے ناموں میں کافی فرق موجود ہے۔ آپ کا ابو بکر شافعی محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ ہے، جس کی ولادت ۲۶۰ھ کی ہے۔ اور ہمارا ابو بکر شافعی محمد بن ابراہیم بن یوسف یا محمد بن یوسف جس کا سال پیدائش ۲۸۱ھ ہے۔ باقی رہا سال حسینی تو اگر امام حسین کی ولادت سے بھی لیجئے۔ تو سال ہجری سے بھی کم ہی ہوگا نہ کہ اکیس برس آگے۔ اس لئے یہ دوسرے ہی ابو بکر شافعی ہیں، جو پہلے شافعی مذہب رکھتے تھے۔ اس کے بعد شیعہ امامیہ مذہب اختیار کر لیا۔ مگر پہلے لقب سے مشہور ہو گئے۔

علمائے شیعہ کی تدلیس

اسی طری کی تدلیس شیعہ ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو۔

مندل بن علی الغزی

مندل بن علی الغزی اہل سنت کی کتابوں میں ایک شیعہ راوی ہے،

مگر شیعوں نے ان کو اپنی کتابوں میں مبدل بہ علی الغزی لکھا ہے اور تصریح کر دی کہ مبدل بائے موحده تحتانیہ سے اور الغزی تائے شتاۃ فوقانیہ ورائے مہملہ سے۔ تاکہ دونوں دو شخص سمجھے جائیں اور مبدل کے حقیقی بھائی حبان بن علی بن الغزی کو صرف حبان۔

حبان بن علی الغزی

گویا حبان بنا کر تصریح کر دی کہ یائے شتاۃ تحتانیہ سے اور بس یہاں غزی کو عتری نہیں بنایا، تاکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے بھائی بھی نہ سمجھے جائیں۔ دونوں کے نام بھی کتابوں میں اتنے فاصلے سے تیار ہوتے ہیں کہ دونوں میں کسی مناسبت کا خیال بھی نہ جاسکے گا۔

مندل کا نام باب المسم میں بہت بعد کو آئے گا اور حبان کا نام باب الخاء المہملہ میں کتاب کے دوسرے ہی ربع میں موجود ہوگا۔

اسی طرح ابو جعفر محمد بن حریر بن یزید الطبری کو جن کی تفسیر اور تاریخ مشہور ہے اور جو بالا اتفاق شیعہ تھے، ابو جعفر محمد بن حریر بن رستم الطبری لکھ دیا۔ تاکہ اہل سنت دونوں کو دو شخص سمجھ لیں، چنانچہ یہی ہوا اور امام ذہبی و ابن حجر جیسے علمائے رجال دونوں کو دو سمجھتے رہے، حالانکہ رستم طبرستان کا رہنے والا تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا نام یزید رکھا گیا۔ ابن حریر نے خود یہ تدلیس کی کہ جو کتابیں خاص شیعوں کے لئے لکھیں، اس میں اپنے دادا کا نام اس نے رستم ہی بہنے دیا اور جو کتابیں عام مسلمانوں کے لئے تصنیف کیں، ان میں اپنے دادا کا نام یزید لکھا۔ شیعوں کے لئے جو کتابیں لکھیں وہ عام نگاہوں سے اس وقت تک برابر پوشیدہ رہیں، جب تک کہ ایران میں حکومت صفویہ قائم نہ

ہوئی تھی۔ جس طرح شیعوں کی تمام خاص کتابیں اور مخصوص عقیدے اس سے پہلے تک برابر پردۂ کتمان میں رہے۔ ابن جریر کی خاص شیعہ تصنیفیں بھی ہناں خانۂ کتمان ہی میں محفوظ رہیں۔ حکومت صفویہ کے احکام کے ساتھ ہی ساری پوشیدہ چیزیں منصفہ شہود پر آگئیں۔ اور شیعہ اپنے اصلی عقیدے اور حقیقی رنگ و روپ میں نمایاں ہو گئے۔ اس وقت اس کا خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ابن جریر کی تصنیفات سے علمائے اہل سنت بدظن ہو کر اس کو حجت و سند نہ سمجھیں، تو پھر جو جو نعم و بزیار ابن جریر اپنی اس تفسیر اور تاریخ میں کر گئے ہیں بار آور نہ ہو سکیں گی، اس لئے فوراً علمائے شیعہ نے اپنی کتابوں میں ایسی تصریحیں لکھنا شروع کر دیں۔ جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ ابن جریر ایک نہیں بلکہ دو تھے اور وہ علماء و عقلائے شیعہ جو ایران سے باہر اہل سنت کے ساتھ گھلے ملے تھے، اہل سنت میں زبانی اس کا پروپیگنڈا بھی کرتے رہے اور یہ ایک خیال اہل سنت کو بھی ایسا رہا کہ اگر اس چیز کو ہم فلاں فلاں صحیح اور حقیقی وجوہات کی وجہ ہی سے سہی مگر رد کر دیتے ہیں یا مشتبہ و غیر مستند مان لیتے ہیں تو پھر یہ چیز ہمیشہ کے لئے ہمارے ہاتھ سے چلی جاتی ہے اور ایسی دوسری چیز ہمارے پاس ہے نہیں جو اس کا نعم البدل ہو، اس لئے ہم ان صحیح و واقعی وجوہات سے چشم پوشی کر لیں گے یہاں تک کہ بر بنائے ضرورت اس کی واقعیت ہی سے انکار کر دیں گے، مگر اس دولت کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔ یہ حلوائے بادام کی قاب فی المثلہ زہر آلود ہی سہی، مگر ہے تو حلوائے بادام۔ اس کی زہر آلودگی سے انکار کر کے تھوڑا تھوڑا کھاتے رہیں تو اس کا مزہ تو آئے گا ہوس تو منے گی۔ زہر آلود کہہ کر واپس کر دینے سے ہوس اور ستائے گی اور یہ یاد کر کر کے کہ ہائے کیا

خوش رنگ اور خوش بو حلوا تھا اور بھی رہ رہ کے طبیعت بے چین ہوگی۔
بس یہی وجہ تھی کہ تفسیر طبری و تاریخ طبری کو بھی اہل سنت نے لگے
لگایا اور مسند احمد کو بھی۔ اور اسی طرح سنن نسائی اور مستدرک حاکم
وغیرہ کو بھی۔

رجوع بسوئے مقصد

غرض اتنی تفصیل کے بعد آپ کو ابو بکر شافعی کی پوری حقیقت معلوم
ہوگئی کہ یہ ایک پکا منافق شخص تھا، درحقیقت شیعہ رافضی تھا اور تقیہ
کر کے شافعی بنا ہوا عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگا رہا۔ اور اس کی پیٹھ پر
وہ کدی اور یورقی والی پارٹی تھی۔ جو درحقیقت بالکل اسی کی طرح تقیہ
باز تھی۔

تصریح سلسلہ تالیف مسند

اور وہ سب کے سب شیعہ ہی تھے مگر اہل سنت بنے ہوئے۔ عبداللہ
بن احمد کی وفات کے بعد اپنی پارٹی کی جمع کردہ جھوٹی سچی روایات کو یک
جا کر کے پورا ذخیرہ ”حد ثنا عبد اللہ حد ثنی ابن لکھ لکھ کر مرتب کر
ڈالا۔ یہ شخص تھا جوا لکھاڑ اور خوشخط، چنانچہ شیخ حلی نے ان کے نام کے
ساتھ الکاتب کا لفظ لکھا بھی ہے۔ اور اس کی متعدد نقلیں بھی اپنی
جماعت کی مدد سے اس نے مہیا کر لیں مگر فوراً اس کی اشاعت ہوتی تو پھر
عبداللہ کے دوسرے مکامذہ بنایت سختی کے ساتھ تکذیب کرتے، اس کا
ذریعہ ہوا تھا، اس لئے جب تک عبداللہ کے تمام بڑے بڑے مکامذہ ایک
ایک کر کے راہی عدم نہ ہوئے، اس وقت تک تو کسی سے مسند احمد کا نام
نک نہیں لیا گیا۔ یہاں تک کہ اس انتظار میں ابو بکر شافعی خود ہی ۳۵۴ھ

میں دنیا سے رخصت ہونے لگے اور ابھی طبرانی جیسا جلیل القدر محدث
متوفی ۳۶۰ھ میں عبداللہ بن احمد کے شاگرد رشید موجود تھے۔ آخر ابو بکر
شافعی نے مرتے وقت ابو بکر قطعی کو یہ امانت سپرد کر دی اور بزبان
حال کہا کہ

سپردم بتو ما یہ خویش را

قطعی تو ابو بکر شافعی کے ساتھ بہتے ہی تھے، اور انھیں کے تربیت
یافتہ وہم مسلک وہم خیال، پھر سن شعور کے بعد سے برابر شریک کار
بھی رہے۔ یعنی ترتیب مسند میں بھی ابو بکر شافعی کے معین و مددگار
رہے، اسی لئے انھوں نے اس مہم کو اپنے ذمے بشوق حمام لے لیا، اور
اب کام ہی کیا تھا، کئی پائی حیرت و طسٹ سے بھی صرف کجا لینا تھا۔ طبرانی کے
انتقال کے بعد یہ ادھر ادھر گھومنے لگے۔ مگر پھر بھی کہیں مسند احمد کا نام
لینے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اپنے کو عبداللہ بن احمد کا شاگرد بھی مشہور
کرتے چلے تھے اور لوگوں نے تسلیم بھی کر لیا تھا کہ عبداللہ کے آخر وقت
میں کچھ حدیثیں ان سے سنی ہوں گی۔ ۱۶-۱۷ سال کی عمر محض بچپن کی عمر
نہیں۔

پھر جس طرح ابو بکر شافعی کو یہ ابو بکر قطعی مل گئے تھے، بالکل اسی
طرح ابو بکر قطعی کو بھی جو سند یا سندہ کے مطابق آخر ایک ہم راز
شاگرد ابن المنذب مل ہی گیا جو درحقیقت منافقت میں ابو بکر شافعی اور
ابو بکر قطعی دونوں کا ہم مذہب تھا۔ اسی ابن المنذب نے مسند احمد کی
اشاعت کا جوا اٹھایا اور ابو بکر قطعی کے انتقال کے کم سے کم پچاس برس
بعد یعنی پانچویں صدی ہجری کے پہلے ربع کے گزر جانے کے بعد دیکھا کہ

اب میدان بالکل صاف ہے۔ عبداللہ بن احمد ہی نہیں بلکہ ان کے اکابر
 بکا مذہ کے دیکھنے والے بھی اب بہت کم رہ گئے۔ تکذیب کا خطرہ اب
 بہت زیادہ نہیں رہا، اس لئے ادھر ادھر مسند احمد کا ذکر کرنے لگے۔ چنانچہ
 خطیب بغدادی سے بھی انھوں نے اپنے سلسلے کا ذکر کیا، جیسا کہ ابن حجر
 نے خطیب کا قول نقل کیا ہے مگر خطیب جیسا نقاد ابن المذنب کے دام
 تزویر میں کب آ سکتا تھا۔ اگر واقعاً خطیب کو ابن المذنب پر کچھ بھی
 اعتماد ہوتا تو خطیب ضرور ابن المذنب سے مسند کی سند و اجازت لے
 لیتے، خطیب ہی نہیں، بلکہ خطیب کے ہم عصر اللہ جانے کتنے محدثین ابن
 المذنب سے مسند کی سند و اجازت لئے ہوتے، مگر کسی نے بھی ان کے
 اس دعویٰ کی طرف توجہ نہ کی۔ بخوبی ممکن ہے کہ خطیب اور اس وقت
 کے دوسرے محدثین نے ابن المذنب کی تکذیب بھی کی ہو، مگر بعد
 والوں نے فقط مسند کا بھرم رکھنے کے لئے اس پر پردہ ڈال دیا، مگر عملی
 تکذیب پر کس طرح پردہ ڈالا جاسکتا ہے، اگر زبانی تکذیب کا کوئی ثبوت
 نہیں تو یہ تو روز روشن کی طرح واضح ہے کہ خطیب اور اس وقت کے
 سارے محدثین نے عملی بے اعتنائی و بے توجہی سے درحقیقت ان کی
 تکذیب کر کے دکھا دی۔ ذہبی و ابن حجر زبانی تکذیب کا ذکر نہ کریں مگر
 اس عملی تکذیب کو جو آفتاب کی طرح چمک رہی ہے، کس طرح چھپا سکتے
 تھے۔ مگر زبانی تکذیب بھی ضروری تھی۔ جمہی تو ذہبی و ابن حجر باوجود
 توثیق مسند کی ضرورت کے ابن المذنب و قطعی کو زبان روکتے نوکتے بھی
 غیر متعین وغیرہ لکھ گئے۔

مختصر یہ کہ باوجود اس کے کہ یہ اپنے ہم عصر محدثین کے پاس مسند کو
 عمر بھر لئے پھرے مگر کسی نے کبھی توجہ نہ کی۔ آخر اپنے دونوں اگلے

مقتداؤں کی طرح یہ بھی صرف ایک شاگرد ابو القاسم رحمۃ اللہ کو ڈھونڈ نکالنے میں کسی طرح کامیاب ہو گئے۔ اور مسند کی امانت انھیں کے سپرد کر کے ۴۴۴ھ میں دنیا سے جدا ہو گئے۔

ان ابو القاسم رحمۃ اللہ صاحب کا بھی بالکل وہی ابن المذہب جیسا حال ہوا ساری عمر مسند احمد کو ہر جگہ ڈھونڈ ڈھونڈ پھرے، مگر علمائے حدیث میں سے ایک شخص نے بھی نگاہ اٹھا کر ان کی طرف نہ دیکھا۔ مجبوراً اپنے اسلاف کی طرح یہ بھی ایک غیر معروف شخص حنبل بن عبد اللہ الرضائی کو اشاعت مسند کی خدمت کسی طرح تفویض کر گئے، چنانچہ حنبل بن عبد اللہ الرضائی کے سوا اور کوئی شیخ القاسم رحمۃ اللہ یا کسی سے بھی مسند کا راوی نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی ہو بھی تو اس سے مسند کی کوئی اہمیت نہیں ثابت ہوتی، جس طرح حنبل بن عبد اللہ الرضائی کے بعد دو چار راویوں کی تعداد مل جانے سے کوئی فائدہ نہیں، مگر اب تک رضائی کے سوا رحمۃ اللہ سے کوئی اور مسند کا روایت کرنے والا کہیں نظر سے نہیں گزرا۔

مشتبہ احاد و ایہیں کبھی قابل قبول نہیں ہوتیں

محدثین کا مشفقہ اصول ہے کہ کوئی ایسی روایت جس کے متعلق غفلت اس کی مقتضی ہو کہ کسی خاص عہد یا ہر عہد میں اس کے جلتے والے اور اس کی روایت کرنے والے بہت کافی لوگ ہوں۔ ایسی حدیث کو اگر اس خاص عہد یا ان سب عہدوں میں صرف ایک یا ایک ایک ہی راوی ایک دوسرے سے روایت کرتے چلے آ رہے ہوں، تو وہ حدیث صرف احاد ہونے کی وجہ سے ظنی ہی نہیں کہی جائے گی بلکہ موضوع یا مشتبہ ہونے کی حیثیت سے رد کر دی جائے گی۔

حدیث آحاد ظنی اور آحاد مشتبہ اور دونوں کا فرق

عہد صحابہ یا عہد تابعی یا عہد تبع تابعی میں کسی حدیث کو صرف ایک ہی شخص اگر روایت کر رہا ہو تو وہ حدیث آحاد ہے۔ اگر تینوں زبانوں میں صرف ایک ہی ایک شخص روایت کرتا ہو یا دونوں میں، تو دہرے یا تہرے آحاد ہونے کی وجہ سے اس کی ظنیت زیادہ قوی ہو کر اشتباہ سے قریب یا قریب تر ہوگی۔

مگر ایسی حدیث جس میں ایسی بات بیان کی جا رہی ہو جس کے متعلق عقل اس کا یقین رکھے کہ اس حدیث کے جلنے والوں اور روایت کرنے والوں کی کچھ زیادہ تعداد ضرور ہونی چاہیے۔ مثلاً ۱۔ وہ واقعہ بیان کیا جا رہا ہے ایک مجمع یا جماعت کے سامنے کا ۲۔ امر یا نہی ہونے کی وجہ سے اس کا حکم پوری یا کسی خاص جماعت پر عائد ہو رہا ہو، اس لئے اس پر اس جماعت کا عمل در آمد ضرور ہونا چاہئے۔ ۳۔ کہا گیا ہو کہ اس کی اطلاع سب کو یا کسی خاص جماعت کو دیدو۔ ۴۔ کسی خاص جماعت یا عامۃ المسلمین کو مخاطب کیا گیا ہو۔ ۵۔ کسی خاص قبیلے یا جماعت کی تعریف میں وہ حدیث وارد ہوئی ہو۔ ۶۔ وہ واقعہ جو بیان کیا گیا ہے کوئی غیر معمولی ہو تعجب خیزی کی وجہ سے مثلاً معجزہ وغیرہ یا کسی اور اعتبار سے۔ ۷۔ جو واقعہ مروی ہو وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے غیر معمولی ہو، وغیر ذلک۔

اس قسم کی روایت کا صرف کسی ایک ہی صحابی سے مروی ہونا ضرور شبہ میں ڈالتا ہے کہ آخر دوسرے صحابہ اس کے متعلق خاموش کیوں رہے اور تابعین نے اس کے متعلق کسی دوسرے صحابی سے کیوں نہیں ۱۔ مثلاً صرف عورتوں یا مردوں یا صرف جوانوں یا صرف بوڑھوں یا صرف مسافروں پر وغیرہ۔

دریافت کیا، اگر اسی ایک صحابی سے متعدد تابعی اور ہر تابعی سے متعدد تبع تابعین بھی روایت کرتے ہوں، جب بھی صرف ایک ہی صحابی سے اس کا مروی ہونا محل اشتباہ ہونا ضرور ہے۔ اسی طرح متعدد صحابہ سے صرف ایک ہی تابعی اگر روایت کر رہے ہوں، جب بھی وہ اشتباہ سے خالی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اگر صحابہ و تابعی سب کا تعدد ہو، مگر سب سے صرف ایک ہی تبع تابعی روایت کر رہا ہو۔

اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے کئی تبع تابعین روایت کر رہے ہوں تو یقیناً اشتباہ دہرے ہونے کی وجہ سے موگد ہو جائے گا اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے صرف ایک ہی تبع تابعی روایت کرے۔ جب تو تہرے اشتباہ کی وجہ سے وہ روایت بہت زیادہ مشتبہ تر ہو جائے گی۔ اور ان تمام صورتوں میں اس قسم کی روایتیں اپنے مراتب اشتباہ کے مطابق مشتبہ ہوں گی اور ان میں سے کوئی روایت بھی کسی بات میں بھی حجت و سند نہیں سمجھی جائیگی اور ضرور وجہ الرد ہوگی، اس لئے کہ ہم کو تو قرآن مجید میں اتباع ظن اور اتباع ماتشابہ سے منع کیا گیا ہے اور یہ شان کفار و مشرکین اور گم راہوں کی بتائی گئی ہیں۔ اسی لئے حدیث میں حکم ہے کہ وایاک و امشبہات یعنی مشتبہ باتوں سے سخت احتیاط کرو۔

تو جب ایک روایت جو اس طرح کی آحاد ہو، وہ مشتبہ ہو جاتی ہے اور اس کا یہ حال ہے تو پورا ذخیرہ جس میں تقریباً چالیس ہزار روایتوں کا انبار لگا ہوا ہے، یہ سارا دفتر مجھ کو کتابی صورت میں مجتمع ایسی بھیانک اور غیر معمولی آحاد سے پہنچتا ہے جس کی احادیث کا سلسلہ تین سو برس تک مسلسل متفرق و مشتبہ راویوں کی پانچ چھ روایتی پشتوں تک

کے بعد دیگرے بلا شرکت دیگرے و بے مداخلت غیرے چلا آ رہا ہے ،
 اس کے ناقابل اعتبار اور مشکوک ہونے میں کیا شک ہے ، حقیقت یہ ہے
 کہ یہ امام احمد کے نام پر اسی قسم کی ناروا سحرانہ حرکت ہے ، جیسی کہ
 سامری نے قبضۃ من اثر الرسول کے ذریعہ کی تھی ۔ اور جس طرح
 اس وقت سامری اپنا اثر جمانے میں کامیاب ہو گیا تھا اسی طرح ابو بکر
 شافعی اور اس جیسے دوسرے سامری مسلمانوں کو دھوکہ دینے میں
 کامیاب رہے ۔ و سيعلم الذين ظلموا ای منقلب ینقلبون ۲۶۵ / ۲۶۶

نوٹ : علامہ تنہا محادی کے حالات کے لئے اسی ادارہ کی شائع کردہ کتاب اعجاز
 القرآن ملاحظہ فرمائیں جس میں سے یہ مضمون لے کر کتابچہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے ۔

